شعاع
MARCH 2002

رفعت ناہید سجاد

اپنا اپنا دامن

digest novels lovers group ❤️❤️

مکمل ناول

باورچی خانے میں کسی چیز کے ابلنے کی بو بڑی دیر سے آرہی تھی۔ بڑی آپا نے چاشت کی نیت کے لیے ہاتھ تو اٹھالیے تھے، لیکن ابھی باندھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ململ کا سفید باریک نیلی کنی والا دوپٹا ان کے جھریوں بھرے وجود کو تخت پر چھپائے ہوئے تھا۔ جیسے کوئی راج ہنس اڑنے کو پر تولے بیٹھا ہو۔ بڑی آپا اس عمر میں بھی کتنی گوری چٹی، کتنی پاکیزہ سی تھیں۔ لیکن ان کا پارہ پھر چڑھ گیا تھا۔

"جو میں نہ ہلوں تو گھر میں چولہا نہ جلے۔ کیا مجال جو کوئی اٹھ کے تنکا بھی دوہرا کرلے۔ ان کا بس چلے تو یہ کہیں نوالے چبا کر ہمارے منہ میں ڈالو آلکس کے مارے، کام چور کتنی دیر سے کہہ رہی ہوں، دیکھو چولھے پر یخنی دھری ہے ابل ابلا تو نہیں گئی لیکن نہ... سلام پھیرنا نیت باندھنا مشکل کردیا۔"

اقصیٰ تخت کے پاس کھڑے ستونوں کے پیچھے دھوپ کے رخ سے بچنے کو کھڑی تھی، پر بڑی آپا کی نگاہوں میں پگھل گئی۔

"یہ کاہل چھپکلیوں کی طرح ایک ہی جگہ پڑے صبح سے شام کردینا۔ نا بیٹی۔ آخر کو ایک دن پرائے گھر جانا ہے۔ نا سہی دادی کا نام۔ ماں کا کون سا نام روشن ہو گا۔ کسی کو احساس بھی ہے۔ بچہ اسپتال میں پڑا ہے۔ اس کو یخنی پہنچانی تھی۔ یہ وقت آگیا۔"

اقصیٰ نے باورچی خانے میں جھانک کر دیکھا۔ یخنی ابل ابل کر چولھے کی ٹرے بھر گئی تھی اور رمضانو

اپنے بالوں سے میل چونٹنے میں مگن تھی۔ گاڑھی گاڑھی چکنی جیلی جیسی یخنی ٹرے میں تھل تھل کر رہی تھی۔

"خاص طور پر بکرے کے گٹ بازار سے لائی۔" باہر سے بڑی آپا کی آواز آرہی تھی۔ حالانکہ بازار انہوں نے کبھی دو قدم چل کر نہیں دیکھا لیکن نقصان کی زیادتی جتانے کے لیے وہ ہمیشہ چیزوں کو اپنا شکار کر لیتی تھیں۔

"رمضانو! دیکھا تو کرو، نہیں تو مت ہانڈی چڑھاؤ۔ تمہیں جوئیں کھوٹنے سے فرصت نہیں۔" اقصیٰ نے دبی آواز میں بڑی آپا کا سارا غصہ ٹیوب کی طرح دبا کر اگل دیا۔

"قسم اللہ پاک کی۔ کیا بتاؤں بی بی! خشکی ہے خشکی۔ باریک کنگھی سے سر کھرچ ڈالا۔ کچھ ہو تو نکلے۔"

یخنی ساری ابل گئی تھی۔ دو چار ہڈیاں دیگچی کی تہہ میں اوندھی ترچھی پڑی تھیں جو بڑی آپا نے دیکھ لیں۔

"کوئی کپڑا تو دو رمضانو!" اقصیٰ پر جھلاہٹ سوار ہو گئی۔

رمضانو بی نے بغل میں دبا ہوا جھاڑن اقصیٰ کو اسی جلدبازی میں تھما دیا۔ میلا چکٹ۔ جیسے بڑی دیر تیل کی کڑاہی میں پکتا رہا ہو۔

"رمضانو! رمضانو! بڑی آپا نے یہ والا جھاڑن باورچی خانے میں دیکھا نا تو اسی سے تمہارا گلا دبا دیں گی۔" رمضانو بلا ٹل جانے پر شریفے کے بیج ایسے دانت نکال کر کھلکھلا دی۔

ٹرے گھسیٹ کر اس نے سنک میں بہائی۔ بہت سارا پانی اوپر سے انڈیل کر فوم سے رگڑ رگڑ کر خشک کیا۔ چولہے پر دوبارہ جما کر اس نے ماچس سے برنر کے سوراخوں میں پھنسا گیلا مادہ گھسیٹا۔ اور آخر میں دو تین بڑے بڑے گلاس بھر کر پانی دیگچی میں انڈیل دیا۔ جو کچھ ضائع ہوا تھا۔ اس کے حسابوں وزن تو برابر ہو گیا۔ شکست وریخت کے بچے کھچے آثار سمیٹ کر اس نے ہاتھ دھوئے۔ اب وہ فارغ تھی۔

"ابل گئی ناں سیاری۔" بڑی آپا ابھی تک تحقیق و جستجو میں مصروف تھیں۔ بڑی آپا کی ناک کو دھوکا دینا ناممکن تھا۔ ہر خوشبو' بدبو سارے گھر میں سب سے پہلے ان ہی کو آتی تھی۔ وہ تخت پر بیٹھے بیٹھے شور مچا دیتی تھیں۔

"اے رمضانو! ہانڈی میں نمک نہیں ڈالا۔" نمک کو سونگھنا صرف بڑی آپا کا طرۂ امتیاز تھا۔

"رجب دین آگیا۔ کم بخت گیٹ سے حقے کی بو ناک کو چڑھی جاتی ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

"ابلی تو نہیں۔ جواب تو دے اقصیٰ! یوں کیوں حیران و پریشان۔"

"کوئی خاص نہیں بڑی آپا! یونہی معمولی سا جوش آگیا تھا۔" وہ بڑی آپا کے لہجے کا کبھی برا نہیں مانتی تھی۔ بڑی آپا اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ بہو بھی سب سے بڑی بن کر آئی تھیں اور اب ایک مدت سے اپنے گھر کی واحد حکمران تھیں۔ ان کا انداز تیموری تھا۔ پر دل فقیری، جو ان کو صحیح طور پر سمجھ لیتا تھا ان سے محبت کیے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔

"رجب دین کو کہیں جانے نہ دیجیو۔ پہلے اسپتال یخنی پہنچا کر آئے پھر کسی کام دام میں الجھائیو اور کام ہی اس سر پھرے کو کون سا ہے۔"

پھر انہوں نے نفلوں کی نیت باندھی اور سلام پھیرتے ہی کہا۔ "یخنی بوتل میں بھیجیو۔"

بڑی آپا تھرموس کو بوتل کہتی تھیں۔ جب اس نے عقاب کی شکل کا سنہری تھرموس یخنی سے لبالب بھر دیا تو جویریہ تلملانے لگی۔ یہ جویریہ کے جہیز کا تھا اور ایک طرح سے طلحہ کے نصیب ہی میں جانا تھا یوں تو ان دنوں ہر تھرموس اسپتال کی زینت بن رہا تھا۔

"دیکھ رجب دین! خبردار جو تو نے اس کا ایک گھونٹ بھی بھرا ہو۔" بڑی آپا نے جاتے جاتے احتیاطاً تنبیہہ کی تھی۔

"میرے باپ کی توبہ۔ چھتیس سال اس گھر کا نمک

کھاتے ہو گئے سمجھے، جو بھی چوری کرتے دیکھا ہو۔ سو سو جوتیاں ماریں جی سر میں۔"

بڑی آپا کو پتا بھی تھا کہ جواب میں ایک تقریر سننے کو ملے گی، لیکن وہ طلحہ کے سلسلے میں کسی ردو رعایت کی قائل نہیں تھیں۔ انہوں نے چاروں طرف سے مطمئن ہو کر پھر نوافل کی طرف توجہ کی۔

اس حادثے سے پہلے اس نے دو یا تین مرتبہ ہی طلحہ کو دیکھا تھا۔ وہ خوشبوؤں اور رنگوں میں بسا شخص، سفید پلاسٹر اور پٹیوں میں جکڑا آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ اسپرٹ کی ناقابل برداشت بو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ وزن کے سہارے لٹکی ہوئی تھی۔

وہ سیمابی طبیعت کا مالک تھا۔ یہ شاید اتفاق ہی تھا کہ اقصیٰ نے کبھی اسے ساکن نہیں دیکھا تھا۔ وہ گھوڑا لے کر نکل جاتا تو سڑکوں پر بھگائے پھرتا پھر رسیوں والی سائیکل نکالتا یا صبح وہ زرد رنگ کے ایک ٹریک سوٹ میں جوگنگ کرتا۔ ان دنوں اسے جویریہ کی قسمت پر بڑا رشک آتا تھا کہ ایسا شاندار آدمی سالم کا سالم اسے ملنے والا تھا۔ لیکن چند ہی روز میں ایسے پے در پے واقعات کا سامنا کرنا پڑا کہ اس کا رشک مایوسی میں تبدیل ہو گیا۔ پچھلی مرتبہ جب وہ بڑی آپا کے گھر آئی تو گرمیوں کی چھٹیوں میں اس نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا۔ وہ پچھلے سال بھی یہاں تھی، لیکن ان دنوں وہ اپنی حرکت میں رہنے والی عادت سے مجبور سسلی گیا ہوا تھا۔

اگلی دفعہ وہ گھر آئی تو اس کا سامنا ہوا۔ وہ باغ کے ایک کونے میں مشقیں کیا کرتا یا گھر سے باہر رہتا۔ گھر آجاتا تو ساری دنیا کے نمبر ڈائل پر گھماتا رہتا۔ وہ باہر کی دنیا سے اپنا رابطہ کسی صورت منقطع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جویریہ دن بھر ادھر ادھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ وہ اپنے کالج کی لٹریری سوسائٹی کی سیکریٹری تھی۔ نوجوان شاعرہ تھی اور کالج کی روح رواں۔ اسے ردا نے بتایا تھا کہ بڑی آپا اور چچا کبیر کے فیصلے کے مطابق طلحہ اور جویریہ کی عنقریب شادی ہو گی۔ وہ ان دونوں کے درمیان رومان تلاش کرتی لہ شاید نگاہوں کا تصادم، کوئی بجلی گراتی مسکراہٹ، کوئی توبہ شکن ادا۔ لیکن وہاں تو ایک عجیب سا سناٹا تھا۔ غالباً" ان دونوں کو ایک دوسرے پر گہرا اعتماد تھا اور اس اعتماد کو دہرانے تہرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہو گی۔ تاہم عام محبتوں میں ہونے والے نظارے اس گھر میں تھے ہی نہیں۔ لوگ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ پیار میں پاگل بھی ہوتے تو کہتے نہیں تھے۔ بڑی آپا ہی کی مثال تھے سب۔ وہ تو بلا شرکت غیرے اس گھر کی مالک تھیں۔ وہ گھر کی ناظم اعلا تھیں اور سارا گھر ان کے حکم کا تابع تھا۔ کسی کی کیا مجال کہ ان کی مرضی معلوم کیے بغیر ادھر کا تنکا ادھر کر دے۔ وہ سب پر حکم چلانا اپنا فرض سمجھتی تھیں، لیکن اقصیٰ کا انہیں بہت لحاظ تھا۔ اقصیٰ ان کے مرحوم بیٹے کی اکلوتی نشانی تھی اور حالات اس کے باپ کی وفات پر کچھ ایسے ہو گئے کہ امی اسے لے کر ننھیال آباد ہو گئیں۔ خالو جان نے پے در پے جائیداد کے مقدموں میں بڑی آپا کو الجھایا ہوا تھا۔ بڑی آپا کو تو یہ ہی غنیمت لگا کہ چودہ سال بعد ہی اپنی پوتی کی صورت تو چھٹیوں میں دیکھ لیتی تھیں۔ یہ تیسرا سال جا رہا تھا۔

اسے بڑی آپا کے گھر میں بچپن کے ایام خواب کی طرح بھی یاد نہیں تھے۔ وہ صرف چار سال کی تھی۔ جب خالہ جان اور خالو جان کی مہربانی سے اس گھر سے نکل گئی اور واپس آئی تو سب سے پہلی اچھی چیز اسے یہاں کا نظام ہی لگا۔ پچھلی مرتبہ وہ جویریہ کے کمرے میں شوریک میں اپنی جوتیاں رکھ کر بھول گئی تھی۔ اگلے سال واپس آئی تو وہ وہیں کی وہیں تھیں۔ صاف ستھری، جھڑی پونچھی نہ میل نہ گرد۔

بڑی آپا اسے اسٹور کی چابی دے کر کہتیں۔ "ذرا چینی تو تلوا لینا۔" وہ اندھیرے گھپ اسٹور میں بھی چینی کے دیو ہیکل ڈبے کو ہاتھ مارتی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ چاول کا ڈبہ چینی کی جگہ اور چینی کا ڈبہ آٹے کی

جگہ آجائے۔ اسی وجہ سے آج وہ تین بیٹوں' ایک بیوہ بیٹی اور ایک مرحومہ بیٹی کی اولاد کو سمیٹ سکی تھیں۔ کبھی اس کی ننھیال والے رونے یہاں نہیں روئے گئے کہ مہینہ ختم نہ ہوا اور پیسے ختم ہو گئے ہوں۔ ان کا تخت اور تخت پر رکھی ساری کتابیں بڑی بابرکت تھیں۔ کبھی مناجات کی کتاب سے سو کا نوٹ باہر آتا۔ کبھی شرح بخاری سے پچاس پچاس کے کرارے نوٹ باہر نکلتے' پہلے پہل وہ سمجھتی رہی شاید نوٹ ان کتابوں میں خود بخود اگ آتے ہیں۔ کتابوں کی برکت سے پھر بڑی آپا نے اسے مذہب کے بارے میں ایسے کچے عقیدے رکھنے پر بڑا لمبا لیکچر دیا۔

عصر اور مغرب کے درمیان وہ وقفہ دیتی تھیں۔ یہ وقت مختصر سا تھا۔ پہلے وہ اس میں تھوڑا سا سو جاتی تھیں۔ لیکن اب ہسپتال جانے لگی تھیں۔ ہر روز ایک آدمی کی ڈیوٹی لگتی۔ طلحہ کا کمرہ اوپر والی منزل میں تھا اور بڑی آپا کو اپنے پیروں پر سیڑھیاں چڑھنے دینے کا رسک کوئی نہیں لینا چاہتا تھا۔ لہٰذا کبھی ردا اور اصغر جاتے کبھی اقصیٰ ساتھ ہوتی اور کبھی جویریہ' طغرل۔ طلحہ پٹیوں میں جکڑا ہوتا۔ صاف ستھرے سفید بستر پر اپنی مظلومیت اور بے کسی کے سائے میں اسے لوگوں کی آمد و رفت سخت ناگوار گزرتی تھی۔ وہ عیادت کو آنے والے کسی شخص کو پسند نہیں کرتا تھا' مع بڑی آپا کے۔ وہ جھنجلا کر وارڈ بوائے اور نرسوں پر برستا' وہ جواباً" بد تمیزی کرتے تو اس کا خون کھول جاتا۔ اقصیٰ نے سنا تھا ابھی اس کو مزید بیس بائیس دن ہسپتال میں رہنا ہو گا۔ تب کہیں پلاسٹر کٹے گا۔ جوڑ ہڈی وغیرہ کی صحیح صورتِ حال کا تب اندازہ ہو گا۔ دوڑنے والے آدمی میں منہ کے بل گرنے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے۔ اسے افسوس ہوتا تھا کہ اتنا قیمتی سا آدمی بات بات پر غصہ کر کے خود کو برباد کرے گا اور تو اور اسے قدرتی امور پر بھی چڑچڑاہٹ طاری رہتی۔ سورج عین اس وقت روشن دان کے اوپر سے گزرتا جب وہ سونے والا ہوتا تھا۔ اس کی تیکھی اور تیز کرنیں عین اس کی آنکھوں پر گرتیں روشندان بند کرنے کے لیے عملے سے گزارش کی گئی لیکن عملہ بھی طلحہ کے لیے دل آزاری کا سبب بنا رہا۔ کمر میں دکھن کی وجہ سے اس کی چیخیں نکلتی تھیں۔ وہ ایک کروٹ کے لیے ترستا تھا اور جب لوگ اس کے اردگرد آ بیٹھتے تھے تو کراہنے اور چیخنے کی اس کی ساری آزادی سلب ہو جاتی۔

خدا کس قدر بے نیاز ہے۔ وہ حیرت سے سوچتی' اسے لگتا تھا کہ جیسے ابھی یہ شخص اٹھے گا۔ دوڑ لگاتا نکل جائے گا یا اٹھ کر باغ کے اس کونے میں دونوں ہاتھوں میں وزنی بٹے دائیں بائیں لہراتا رہے گا۔ خدا معلوم اسے ورزش کا اتنا جنون کیوں تھا؟ اقصیٰ نے چونکہ یہاں نیا نیا آنا شروع کیا تھا۔ اس لیے وہ بہت سے رازوں سے آگاہ نہ تھی۔ وہ اپنی محبت میں جویریہ کو چند کام کی باتیں بتاتی۔ مثلاً" یہ کہ یہی موقع ہے طلحہ کی خدمت کر لو ساری عمر کے لیے خرید لو گی۔

"کیا خدمت کروں؟" جویریہ الٹا اسی سے پوچھتی۔

"ٹانگیں دبا دیا کرو۔"

جویریہ مدبر سی لڑکی تھی۔ بڑی آپا کے گھرانے کی تربیت یافتہ' اس قسم کا بے ہودہ مذاق' وہ بھی ایک زخمی سے اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

بڑی آپا ٹفن کیریر بھر بھر اس کے لیے پہنچاتیں لیکن وہ واویلا مچائے جاتا۔ جس چیز کی وہ فرمائش کرتا اسے نہ ملتی۔ جس چیز کے کھانے سے انکاری ہوتا اسے ہر روز کھانی پڑتی اس لیے نہیں کہ اس پر توجہ نہیں دی جاتی تھی یا وہ کسی کا لاڈلا نہیں تھا۔ اور کسی کو تو چھوڑو بڑی آپا کی تو وہ آنکھوں کا تارا تھا۔ اس نے طغرل سے سنا تھا۔ حادثے کے بعد بڑی آپا کی کتنی بری حالت ہو گئی تھی۔ حالانکہ ابھی تو حادثے کی شدت ان سے چھپالی تھی اور اس وقت تک ان سے کچھ کہا بھی نہیں جب تک ڈاکٹر نے زندگی کی ضمانت نہیں دے دی ورنہ بڑی آپا تو خدانخواستہ ساتھ ہی جان دے دیتیں۔ بڑی آپا

علاج معالجے کے لیے تخت پر رکھی ایک دیمک زدہ کتاب "گھر کا سنیاسی" پر زیادہ بھروسا کرتی تھیں۔ کبھی اوجڑی پکواتیں تاکہ معدہ مضبوط رہے، دیسی گھی میں اور گھی بھی اتنا کہ ٹفن میں بس گھی ہی گھی تیرتا۔ خوب چکنا سا حریرہ ہوتا، سوکھا حلوہ، گاجر کا حلوہ وہ کھانے دیکھ دیکھ کر بھنا جاتا۔ بڑی آپا ساتھ آتیں تو زہرمار کرلیتا ورنہ کھانا ویسے کا ویسا واپس ہوجاتا۔

جویریہ اس کے لیے کھانا بھی نہیں پکاتی تھی۔ اسے صفائی کا جنون تھا۔ وہ سارا دن کپڑا لے کر چیزوں کو رگڑتی رہتی۔ حتیٰ کہ چیزیں جگمگانے لگتیں۔ اقصیٰ کو اور تو کوئی کام نہ ہوتا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک کمرے سے دوسرے کمرے بے تکے فضول سے سوالات کرتی۔

"سنو جویریہ! بھلا طلحہ کا حادثہ کس طرح ہوا؟"

"اوور ٹیکنگ کرتے ہوئے۔" اس نے ہمیشہ کی طرح مختصر جواب دیا۔

"اوور ٹیک تو سب کرتے ہیں۔"

"سامنے سے ٹرک آرہا تھا۔" دوسرا مختصر جواب۔ اب وہ بیڈ کے پائے چمکا رہی تھی۔

"لیکن طلحہ بھائی اتنے غصیلے کیوں ہیں اور ان کی امی ابا بہن بھائی وغیرہ کہاں ہیں؟" وہ شاید سوالوں سے بچنے کے لیے وم کا ڈبہ لے کر غسل خانے میں گھس رہی تھی۔

"ارے جب طلحہ بھائی چھوٹے سے تھے تو ان کی امی فوت ہوگئی تھیں۔ ان کا چھوٹا بھائی ہوا تھا غریب وہ بھی فوت ہوگیا۔ بڑی آپا نے طلحہ بھائی کو یہاں پر ہی رکھ لیا۔ اس وقت ان کے ابا جیل میں تھے۔"

"جیل میں۔" اسے چوروں سے بڑا ڈر لگتا تھا۔

"ہاں وہ سیاست دان تھے ناں۔ جیل ہی میں فوت ہوگئے۔"

اقصیٰ سہم گئی۔ اسے ایسی بوجھل کہانیوں سے نفرت تھی جو اسے اس کا ماضی دکھاتی رہتیں۔ جب اس کی امی فوت ہوئیں تو بے چارے چھوٹے بچے نے کیا سوچا ہوگا۔ اس کی امی، آخر کہاں گئیں پھر جب ابا بھی فوت ہوئے ہوں گے۔ بڑی آپا تو مرغی کی طرح پر پھیلا پھیلا کر آنے والوں کو اپنی پناہ میں رکھتی جاتی ہیں۔ وہ بھی چار سال کی تھی۔ ابا کے انتقال کی بات تو اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لوگ روتے رہتے تھے اور وہ بڑی آپا کی گود میں سو جاتی۔ اسے روتی ہوئی شکلوں میں خاص طور پر اپنی امی کی شکل سے نا معلوم سا خوف آتا تھا۔ اس دن بھی وہ بڑی آپا کی گود میں سوئی پڑی تھی کہ خالو جان آگئے۔ اس نے ان کی آواز کا شور سنا تھا لیکن وہ اسے جگانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ وہ جاگی تو صبح ہوچکی تھی اور یہ بڑی آپا کا گھر نہ تھا۔ وہ ابا کے لیے تو رو نہیں سکی۔ لیکن بڑی آپا کے لیے دن رات روتی اور خالو کے سہم سے آواز بھی نہ نکالتی۔ نانا اور وہ، بڑی آپا کے دشمن تھے۔ نانا کی زندگی میں امی نہ کبھی خود گئیں نہ کبھی اسے بھیجا۔ ہاں ان کے انتقال پر چچا کبیر پُرسے کے لیے آئے تو اسے زبردستی لے گئے۔

زی ٹی وی کا مشہور پروگرام

کہانا خزانہ

نیا ایڈیشن

سنجیو کپور

خوبصورت تصاویر کے ساتھ

حسین و خوبصورت گیٹ اپ

قیمت صرف =/250 روپے

ملنے کا پتا:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی

ان دنوں وہ بی اے کے فائنل میں تھی۔ پھر اسے ایسا چسکا پڑا کہ اگلے سال، پھر اس سے اگلے سال ضد کر کے اور رو دھو کے وہ ہو ہی آتی تھی۔ اس مرتبہ وہ یہاں پہنچی تو حالات بدلے ہوئے تھے۔ بڑی آپا کا منظورِ نظر حادثے کا شکار ہو کر ہسپتال میں داخل تھا اور اسی لیے بڑی آپا بوکھلائی بوکھلائی سی تھیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کاش وہ کسی طرح بڑی آپا کے کام آسکے اور ان کا دکھ بانٹ سکے۔ طلحہ کی ماں کا صدمہ یا اس کے ابا کا صدمہ، براہِ راست بڑی آپا کا صدمہ تھا لیکن وہ کس قدر صابر اور گمبھیر تھیں سوائے خدا سے لو لگانے کے اور کچھ بھی نہ کرتیں۔ اسے کچھ نہ سوجھتا تو وہ جویریہ پر چڑھ دوڑتی۔

"یہ تم طلحہ بھائی، طلحہ بھائی کیا کہتی ہو؟"

"کیوں؟" وہ جھکی ہوئی بیسن کا اسٹینڈ چمکا رہی تھی۔ "تم سب جو کہتی ہو۔"

"ہم اور تم برابر تو نہیں نا۔" وہ تو نادانی سے ہنس پڑتی لیکن جویریہ اسی طرح سنجیدہ سنجیدہ، چپ چاپ۔ اقصیٰ نے یہاں آکر بڑے بڑے سبق سیکھے تھے۔ سنجیدگی کے سبق، شوخی کے سبق، صبر و ضبط کے سبق۔ بڑی آپا خالو جان کی طرح تقریریں نہیں کیا کرتی تھی نہ خالہ کی طرح اپنی قسمت پر بین۔ وہ جو کچھ سکھانا چاہتی تھیں، بن کہے سکھا دیتی تھیں اور پھر عمل کروا کے دم لیتی تھیں۔ وہ کسی کو شرمندہ بھی نہ کرتیں لیکن حالات ایسے پیدا ہوتے کہ مجرم آپ سے آپ شرمندہ ہو جاتا۔ اس کی ننھیال میں وافر پکتا تھا۔ چونکہ افراط سے پکتا تھا۔ لہٰذا افراط ہی سے بچ بھی جاتا تھا۔ رکابیوں میں، ڈونگوں میں، چمچ میں، دیگچی میں، ہر جگہ سیالن ہی سالن ہوتا۔ یہاں پر بھی اقصیٰ کی یہی عادت تھی، وہ کھا کر اٹھتی تو شوربے اور آلو کے بچے کھچے ٹکڑے پلیٹ میں تیرتے پھرتے۔

بڑی آپا فہمائش کرنے کے بجائے ایک لقمہ توڑ کر اس کی ساری پلیٹ صاف کر دیتی تھیں۔ کئی دفعہ اس نے یہ بد تمیزی کی اور کئی دفعہ بڑی آپا کو اس کا بچا کھچا کھانا پڑا۔ وہ کھانے کے بارے میں نخرے بھی بہت دکھاتی، میں دال نہیں کھاتی، مجھے پالک اچھی نہیں لگتی، یہ کدو کیوں پکایا ہے لیکن بڑی آپا کے ہاں سب کچھ پکتا تھا اور سب کچھ کھایا جاتا تھا۔ سو اس نے بھی کھانا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود انہیں یہ خوف دامن گیر رہتا کہ کہیں کوئی نہ کوئی کمی رہ گئی ہے۔ ورنہ ان کے آزمائش کے دن اب تو لگتا تھا تمام ہو گئے۔

وہ دن رات تخت پر طلحہ کے لیے دعائیں کرتیں۔ انہیں سرجری کے شعبے کا تو علم نہیں تھا لیکن جانتی تھیں طلحہ نادانستگی میں لوگوں کا دل دکھاتا رہا ہے، وہ اس کے بھی بخشے جانے کی دعا کرتیں یا اس کے گناہ اپنے ذمے لینا چاہتی تھیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتی تھیں۔

ان دنوں ڈاکٹر رحمٰن نے دوستوں کے سامنے تجویز رکھی تھی۔ طلحہ کو انجکشن بھی دیے جا رہے تھے۔ دوائیں بھی لیکن پلاسٹر اتارنے سے پہلے کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرنا تھا۔ اگر مریض کے چڑچڑے پن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کچھ عرصے کے لیے اسے واپس بھیج دیا جائے اور پلاسٹر کٹوانے کے لیے واپس بلایا جائے تو کیسا ہو۔

عملے کا خیال تھا کہ یہ صائب رائے ہے بشرطیکہ مریض بے تحاشا محتاط ہو اور زیادہ ہل جُل کے اپنا جوائنٹ نہ ہلوا لے۔ طلحہ کو گھر آنے کی بھی جلدی نہیں تھی، وہاں رہنے کا بھی یارانہ تھا۔ وہ گھر آیا تو اس کے پیر سے وزن تو اتار لیا گیا تھا، لیکن جسم پلاسٹر سے جکڑا ہوا تھا۔ لوگ اس کے گرد ایسے جمع ہونا شروع ہوئے جیسے چڑیا گھر میں دو کوہانوں والا اونٹ آیا ہو۔ طلحہ سب سے آنکھیں بچا رہا تھا اور کسی کو ڈھونڈ بھی رہا تھا۔

اقصیٰ نے جویریہ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا ہاتھ الٹ کر انگلیوں کے ناخنوں پر غور کر رہی تھی۔ کیا جویریہ پتھر دل ہے، وہ اتنی دُکھتی ہوئی، ڈھونڈتی ہوئی نگاہوں کے سامنے کیسی گونگی بہری بن جاتی ہے۔ بڑی آپا صدقے واری تو ہو رہی تھیں لیکن انہیں لوگوں کے سامنے اپنا مورچہ کمزور کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن

سجدے میں وہ طلحہ کی ٹانگیں، انہیں اپنے اور خدا کے درمیان کسی کو ہمراز بنانا اچھا نہیں لگتا تھا۔

طلحہ کے لیے حکم تھا، وہ سخت بستر پر سوئے گا اور زیادہ اٹھک بیٹھک نہیں کرے گا۔ لہٰذا طلحہ اور بڑی آپا کی منشا سے اس کے کمرے میں زمین پہ میٹرس ڈال دیا گیا تھا۔ کشن اور تکیوں سے اس کے بازوؤں اور پیٹھ کو آرام دینے کی کوشش کی گئی۔ خدا کا خوف تھا یا بڑی آپا کا حکم، جو یہ آنکھیں جھکائے مسلسل احکامات کی بجا آوری کرتی رہی۔ طلحہ کا اس مشقت سے سانس چڑھ گیا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تربتر تھا۔ باہر طغرل بھائی، ادریس بھائی کو ڈاکٹر کی رپورٹ سنا رہے تھے۔

"دائیں ٹانگ کا صرف جوائنٹ ہلا ہے۔ پلاسٹر اتارنے کے بعد ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن بائیں ٹانگ میں انجری سخت ہوئی ہے۔ اس کی ایڑی اور ایڑی کے اوپر والا پٹھا کٹ گیا۔ گمان ہے کہ بے ہوش طلحہ کو گھسیٹتے ہوئے لوگوں نے خیال نہیں کیا اور کسی تیز دھار چیز سے ٹانگ کا پٹھا بالکل کٹ گیا۔ گرافٹنگ کے بعد اس کا فیصلہ کیا جا سکے گا کہ آیا وہ دوبارہ چل پھر سکتا ہے یا نہیں۔"

اقصیٰ کا دل شق ہو گیا۔

اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ طلحہ کو دیکھا تو وہ رجب دین سے جوتے چمکانے کے مسئلے پر جھگڑا کر رہا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے کپڑا چھین لیا اور گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر جوتے کو دائیں سے بائیں تیزی سے گھماتا رہا۔ جیسے چاقو چھری کی دھار بنا رہا ہو۔ جب وہ چم چم کرنے لگے تو اس نے رجب دین کی طرف غصے سے دیکھا۔

"دیکھا۔"

جب وہ تیار ہو کر کھڑا ہوا تو اس کے جوتے سوٹ کے ساتھ چوں چوں بول رہے تھے۔ وہ کسی ڈنر کے لیے نکلا تھا اور تیز تو تھا۔ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ایک منٹ میں کمرے سے پورچ اور پورچ سے باہر۔

یہ پچھلے سال کی بات ہے۔

کیا کوئی دوڑتا بھاگتا شخص اس طرح بھی ساکن ہو سکتا ہے۔ اس طرح بھی رک سکتا ہے۔ انسان نہ ہوا زنگ آلود گھڑی ہو گئی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں زمین کو روند روند کر چلنے والا شخص، ایک دن تہی دست سا زمین پر آپڑے گا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تربتر تھی۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ بہت بے چین ہو رہا تھا۔ ایک خلقت جمع تھی، مشورے مفت تقسیم ہو رہے تھے۔ کبیر چچا کہہ رہے تھے۔

"علاج تبدیل کر لو صحیح تشخیص نہیں ہو رہی۔"

منیر چچا کہتے تھے کہ "ہومیو پیتھک علاج میں شفا ہے۔"

سفیر چچا کچھ نہیں بولتے تھے کیونکہ ان کے حصے کا اختری چچی کو بولنا ہوتا تھا۔

طلحہ نے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ وہ زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ لوگ کھڑے ہو کر مشورے لٹا رہے تھے۔ بڑی آپا سہم سہم کر ایک ایک کا منہ دیکھ رہی تھیں۔ اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔ اقصیٰ نے ڈرتے ڈرتے جگ کو چھوا۔ وہ اس کے روکھے پن سے خوف کھا رہی تھی۔ گلاس میں پانی انڈیلا اور اسے تھما ہی دیا۔ اس نے پانی دینے والے کی طرف دھیان سے دیکھا بھی نہیں۔ اس پر ویسے بھی نیند کی دواؤں کا اثر تھا اور شور اس کے مزاج کو چبھتا تھا۔ وہ ناامید اور مایوس آنکھوں سے مشورے لٹانے والوں کو دیکھنے لگا۔ خدا جانے وہ کس سے ناامید ہو گیا تھا۔ زندگی سے یا زندگی گزارنے کے ڈھب سے۔

اس کے کمرے سے ملحقہ چھوٹا کمرہ میل نرس کے لیے تھا جسے طغرل نے اپنا ذاتی اثر و رسوخ استعمال کر کے بڑی مشکل سے دریافت کیا تھا۔ اس نے اپنے کمرے سے نکل کر خواتین و حضرات سے مؤدبانہ گزارش کی کہ یہ کمرہ خالی کر دیں۔ بصورتِ دیگر مریض کو دوبارہ اسپتال لے جایا جائے گا۔

بڑی آپا تو دن رات اس کے کمرے میں نہیں رہ سکتی تھیں۔ وہ دن رات کے لیے اپنے کمرے میں کسی کو برداشت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بد مزاج، اپاہج

بوڑھوں کی طرح آئے گئے پر بڑبڑاتا رہتا۔ یہ تیسرا دن تھا جو وہ فاقہ کر رہا تھا اور کھانے کی ٹرے اسی طرح اَن چکھی واپس آ رہی تھی۔ ان دنوں باورچی خانے میں جویریہ کی ڈیوٹی تھی۔ وہ جب بھی کھانا واپس کرتا جویریہ چڑ جاتی۔

"دیکھا فیروزہ!"

بڑی آپا مریض کی مرضی پر یقین نہیں کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ مریض تو باؤلا ہوا ہے تم میری مرضی پر چلو۔

اور ایک دن تو مریض اتنا باؤلا ہوا کہ رمضانو اس کے کمرے سے آکر دہائی دینے لگی۔ طلحہ صاحب نے برتنوں کی ٹرے اس کے سر پر دے ماری تھی۔ جویریہ نے معنی خیز انداز میں مہ رخ کو دیکھا تھا۔ اقصیٰ ان میں سے نہیں تھی' اسے اس بات کا دکھ بھی بہت تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کی سازشوں میں آخر اسے شامل کیوں نہیں کر لیتیں' آخر ایک دفعہ اعتبار کرنے میں کیا حرج ہے' جویریہ اس کی خوشامد کر رہی تھی کہ ایک دفعہ اور ٹرے اس کے کمرے میں پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن رمضانو نے توبہ مانگ لی۔

اقصیٰ کو مشکل مشکل کاموں میں ہاتھ ڈالنا اچھا لگتا تھا۔ اس نے سارے پلنگ کی چادر باریک سفید دھاگے سے کروشیے سے بنی تھی۔ کیونکہ بڑی خالہ نے کہا تھا۔ "اس پر مغز ماری فضول ہے۔ تم میں اتنا پتہ نہیں۔"

اس نے موٹر سائیکل چلانا سیکھی۔ پہلے پہل تو وہ گھوڑے کی طرح اگلی ٹانگوں پر کھڑی ہو گئی اور اقصیٰ چاروں شانے چت نیچے لیکن اب وہ خوب بھگائے پھرتی تھی۔ زہیر کا خیال تھا۔ وہ ساری زندگی دو پہیوں کے وہیل پر کنٹرول نہیں کر سکتی۔ ایک مرتبہ اس نے گھر کے ایک کونے کی گری ہوئی دیوار کھڑی کی تھی۔ حالانکہ راج مستری لڑ گیا تھا اور دھمکی دے کر گیا تھا کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

"میں لے کر جاؤں کھانا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔ مہ رخ اور فیروزہ ہنسنے لگیں۔

"تم... ہونہہ... وہ تمہارے بس کی چیز نہیں۔ رہنے دو تم سے نہیں ہونے کا۔"

وہ آخر بڑی آپا کی پوتی تھی۔ اسے جوش آگیا۔

وہ طلحہ کے کمرے میں تنہا پہلی دفعہ گئی تھی۔ سفید لٹھے کی چادر سینے تک تانے وہ کن پٹیوں کو سہلا رہا تھا۔ یہ غصہ شاید ٹرے سر پر پھینکنے کے بعد بھی باقی تھا۔ اسے آتے دیکھ کر لمحوں کے لیے اس کی آنکھیں ناشناسا سی حیرانی سے دوچار ہوئیں۔ اس کو گمان ہو گا کہ بدمزاجی کے اس دورے کے بعد اب اس کے کمرے میں آنے کی کوئی جرأت نہیں کرے گا' لیکن اب اقصیٰ اندر آگئی تھی اور اسے پلنگ پوش تو مکمل کرنا ہی تھا۔

"سنا ہے آپ آج کل بڑے بدمزاج ہو رہے ہیں۔" وہ آلتی پالتی مار کر اس کے نزدیک ہی فرش پر بیٹھ گئی۔ "یا شاید پہلے سے ایسے ہوں؟"

اس نے حیرت زدہ ہو کر ایک نظر اس پُراعتماد سی لاپروا لڑکی کو دیکھا۔ وہ خود سے کس قدر بے نیاز تھی اور اس کے کمرے میں اس کے روبرو صرف اس لیے ڈھٹائی سے آبیٹھی تھی کہ اسے اس سے کیا خوف ہو سکتا تھا بھلا؟

طلحہ تلملا گیا۔ وہ برا آدمی نہیں تھا لیکن اسے خود پر ترس کھانے والوں پر غصہ آنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ بھوکے شیر کے عین کچھار پر اس لیے آبیٹھی تھی کہ وہ جانتی تھی کہ شیر لنگڑا ہے۔ اس طرح بہادری کے تمغے اپنے سینے پر سجا کر اپنی برادری میں ڈینگ مار سکے۔

وہ بدگمان ہونے پر آمادہ ہی تھا کہ اس کے بولنے سے پہلے وہ پھر بول اٹھی۔

"اب دیکھیے! رمضانو کے ہی آپ نے ٹرے الٹ کر ماردی۔"

"میں نے؟" وہ حیران رہ گیا۔ "اور آپ سے کس نے کہا' رمضانو نے؟" وہ سیخ پا ہونے لگا۔

"میں نے تو صرف اتنا کہا تھا میں یہ ٹرے تمہارے سر پر مار دوں گا۔ ابھی ماری نہیں تھی لیکن آئندہ آئے گی تو ضرور ماروں گا۔"

اقصیٰ شگفتگی سے ہنسنے لگی۔
"چلو ایک الزام تو صرف بہتان ہی ثابت ہوا۔ البتہ 'اقدام قتل کی بو آپ کے فقرے سے آتی ہے۔ آپ کھانا کھانے کو کیا سمجھتے ہیں؟" اس نے ایک دم ہی پیڑی بدلی۔
"کھانا انسان کھاتا ہے کہ اب جینا ہی ہے تو کھانا ہی پڑے گا۔ اس لیے تو نہیں کہ بس کھانا اول کھانا آخر۔"
طلحہ اپنی برداشت کھو دینے کو تھا۔ اسے اس قسم کی نیم پڑھی لکھی لڑکیاں زہر لگتی تھیں۔ جو اخلاقی' اصلاحی اور معاشرتی ناول پڑھ کر ڈائیلاگ سنانے اسے آجاتی تھیں۔ گھر میں گھسی عورت کو اپنے نام نہاد علم پر بھی دیکھو کیسا فخر ہوتا ہے۔
لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ اسے یاد آگیا تھا اس نے اسے شاید پہلے بھی دیکھا تھا اور اب کے بھی وہ بڑی آپا کے ساتھ اسپتال آتی تھی۔ بڑی آپا نے بتایا تھا وہ غالباً" مہمان ہے اور مہمانوں کو آخر کار چلے جانا ہوتا ہے لہٰذا ان کے ساتھ وہ کسی قسم کی بدلحاظی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے بیماری نے بڑا صابر اور منکسر المزاج بنا دیا تھا یہ اور بات کہ لوگ اب اسے چڑچڑا کہنے لگے تھے۔ لیکن ان دنوں وہ جو کچھ برداشت کرنے لگا تھا' عام دنوں میں کبھی نہ کرتا۔ اس نے چادر کندھوں تک کھینچ لی اور برداشت کے ہر روز گزرنے والے دور سے گزرنے لگا۔
اب کے اقصیٰ اس سے نرم روی سے سوال کر رہی تھی۔
"آپ کس نوعیت کی چیزیں پسند کرتے ہیں۔ سبزی یا گوشت میں آپ کی ترجیحات کیا ہیں؟ وغیرہ۔"
وہ جانتا تھا یہ گھر میں رہنے والی کزنز وغیرہ دوسروں کے ذاتی معاملات میں بلا جھجک دلچسپی لینے لگتی ہیں۔ وہ اختری چچی کا ڈسا ہوا تھا۔ جنہوں نے لاڈ پیار میں اس سے عجیب عجیب باتیں کر کے اندر ہی اندر جانے کیا کچھ اگلوا لیا تھا اور سب کچھ جا کر اپنی ساس سے جڑ دیا۔ سرخروئی کی سرخروئی ملی۔ باقی بہوؤں سے نمبر بھی زیادہ ہو گئے اور وہ گھر بھر میں اتنا بدنام ہوا کہ رہنے کے قابل بھی نہ رہا۔ بڑی آپا کی خفگی الگ اس کے لیے مصیبت کا باعث بن گئی۔ وہ اختری چچی' سفیر چچا کا مع ان کی اولادوں کے سخت دشمن ہو گیا تھا لیکن اس کی دشمنی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ عورت کا وار کاری ہوتا ہے اور اختری چچی بڑی کاری ضرب لگا چکی تھیں۔ اس کا کوئی توڑ نہ تھا' یہ تو حادثہ اس کے لیے نعمت بن گیا۔ جو لوگوں نے پرانے جھگڑے معاف کر دیے یا عارضی طور پر بھلا تو دیے۔
"کچھ نہ کچھ تو آپ کو کھانا پڑے گا۔ آپ جو بھی پسند کریں۔ آخر آپ ایک میچور آدمی۔"
"اچھا آپ چاہتی کیا ہیں؟" وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ "لائیے رمضانو سے وہ ٹرے واپس' ابھی کھا لیتا ہوں۔"
وہ خاموش سی ہو گئی۔ یہ شخص کافی ٹیڑھی کھیر تھا۔ ابھی اس نے ٹرے پھینکی تھی اور اب بغیر کسی پس و پیش کے واپس لینے کو تیار تھا۔ صرف اسے اپنے سامنے سے ٹالنے کے لیے۔
کچن میں جا کر اس نے پھر کھانا اتارا۔ ٹرے لگائی۔ فرج میں سے یخ بوتل نکالی۔ میرے خیال میں یہ ان لوگوں میں سے ہے جو ہر وقت لوگوں کی توجہ کے طلب گار رہتے ہیں۔ اقصیٰ سوچنے لگی۔ ایسے لوگوں کو پیار سے سمجھانا زیادہ بہتر رہتا ہے لیکن یہ کام جو پریہ کرے تو ہر طرح سے مناسب رہے گا' لیکن وہ تو روکھی روکھی اور خفا خفا سی ہے۔
وہ دروازہ کھلنے کا ہی منتظر تھا۔ اس کو دیکھ کر خود سے بیٹھ گیا۔ اقصیٰ نے بیک ریسٹ اٹھا کر کمر کے پیچھے سیٹ کی' کھانے کی لمبی والی ٹرالی بڑی احتیاط سے اس کی زخمی ٹانگوں سے گزار کر اس کے سینے کے نزدیک کر دی۔ طلحہ نے ڈھکنا اٹھا کر دیکھا۔ گہرے چمچے سے ہلدی ملا گھی کا شوربہ تھوڑی سی اونچائی تک لے کر گیا اور ٹپ ٹپ ڈونگے میں گرا دیا۔
"یہ دیکھیے! ایک ایسا شخص جو ایتھلیٹ تھا لیکن اب سارا دن بستر پر پڑا رہتا ہے اسے ترتراتا ہوا اصلی

گھی کہاں تک ضرر نہیں پہنچائے گا یعنی آپ لوگوں کی صلاح اگر یہی ہے کہ جو ایکسیڈنٹ سے بچ گیا ہے اسے ہارٹ اٹیک سے مار دیا جائے۔ تو بسم اللہ۔"

اس نے روٹی کے ٹکڑے گھی میں چور چور کے کھانے شروع کردیے۔

اقصیٰ پریشان ہوگئی۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن یہاں تو دنیا اسے وہمی اور پاگل قرار دینے پر تلی ہوئی تھی۔ اگلے روز دوپہر کو وہ دوبارہ طلحہ کے کمرے میں گئی۔ وہ سائیڈ لیمپ کی دودھیا روشنی میں کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ کمرے میں ٹھنڈا ٹھنڈا ہلکا سا اندھیرا تھا۔ لیمپ کی روشنی کتاب کو چمکا رہی تھی۔ ایسا ٹھنڈا اتنا پُرسکون ماحول... اس نے اپنی بیماری کی حالت میں بھی کمرہ مکمل ترتیب دے رکھا تھا۔ وہ معزول بادشاہوں کی طرح خوئے حکمرانی سے آگاہ تھا۔ کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ قالین صاف ستھرا اور چمکدار تھا اور کمرہ تازہ پھولوں کی خوشبو سے معطر۔

اگلے روز پھر اسے اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر اس کی تیوری پر ہلکی سی بیزاری کی لہر آگئی۔ وہ کتاب ختم کرنا چاہتا تھا۔ لیکچر سننا نہیں۔ اقصیٰ نے چپ چاپ ایک کارڈ اس کے حوالے کردیا۔ طلحہ نے کتاب الٹا کر سینے پر رکھ لی اور اس کے ہاتھ سے کارڈ لے لیا۔ یہ خوب صورت سے چکنے سبز رنگ کا کارڈ تھا جس کے سرورق پر سنہری حروف میں انگریزی میں "مینو کارڈ" لکھا تھا۔ اردگرد ننھے ننھے پھول پینٹ کیے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے طلحہ حیرت زدہ سا ہوا۔ اس نے کھول کر دیکھا۔ یہ باقاعدہ کسی ہوٹل کے کارڈ کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا تھا پہلے صفحے کے آدھے حصے پر سوپ کی تفصیلات تھیں۔ پھر گوشت چاول نوڈلز انڈہ اسنیکس۔ صرف ان کے سامنے قیمتیں تحریر نہیں تھیں۔ نیچے سنہری حروف میں موٹا موٹا لکھا تھا اقصیٰ پروپرائیٹر اینڈ کمپنی۔

وہ مسکرانے لگا۔ "اقصیٰ آپ کا نام ہے؟" مسکرانے سے اس کی آنکھوں میں شفاف صحت مند چمک ابھر آئی۔ جیسے اس مذاق کا اس نے بڑا حظ اٹھایا ہو۔

"جی، اب آپ یہ فرمایئے کیا کھانا پسند کریں گے۔" وہ جھینپی جھینپی سی تھی۔

"پہلے تو میں یہ پوچھنا پسند کروں گا یہ آئے گا کہاں سے، کسی ہوٹل سے؟"

"جی نہیں گھر پر تیار ہوگا۔"

"کون تیار کرے گا؟" وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا۔

"میں!"

وہ مسکراتے مسکراتے یک لخت سنجیدہ ہوگیا۔

"میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ کسی شخص کو اپنی وجہ سے اتنی ناجائز تکلیف دوں۔"

"مجھے اس تکلیف میں مزا آئے گا۔ آپ کو نہیں پتا نا اس میں میرا ایک مفاد وابستہ ہے۔" وہ چوکڑی مار کر اس کے نزدیک ہی قالین پر بیٹھ گئی۔

"مفاد، وہ کیا ہے؟"

"میں نے نیا نیا کورس کیا ہے۔ میرا پکایا کوئی کھانے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ آپ ہو جائیں گے تو میں ممنون ہوں گی۔ میرا تجربہ بھی بڑھ جائے گا۔"

وہ حیرت سے اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔ لوگ کسی کا معمولی سا کام کرکے اس پر احسانوں کا بوجھ لاد دیتے ہیں۔ ٹوکرے بھر بھر اور یہ الٹا خود احسان مندی کے جذبات کا اظہار کر رہی ہے۔

"اچھا!" اس نے اس کے ہاتھ سے دوبارہ کارڈ واپس لے لیا۔ وہ غور غور سے ایک ایک آئٹم پڑھ رہا تھا اور مسکراتا بھی جا رہا تھا۔

"اگر یہ سب نہیں بھی ان میں سے کل تین کھانے بھی مجھے مل جائیں تو بیماری کے باقی دن، میں وہ ہلدی والا گھی پی کر گزار سکتا ہوں۔ بیف برگر، اگر زحمت نہ ہو۔"

وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ اسے لگا آج اس نے خالو جان کو شکست دے ہی دی ہے۔ وہ ان کی غراتی آواز بھولی نہیں تھی۔ جب وہ اس کے دشمن ہوگئے تھے اور امی سے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

"اس کو پڑھائی سے اٹھاؤ کوئی کورس ہی کرانا ہے تو سلائی کڑھائی کا کرادو۔ کھانے پکانے کا کراؤ۔ یہ ایم اے ویم اے میں کیا رکھا ہے' واہیات۔ عورت کی حیثیت تو ایک گلدان کی سی ہے۔ جسے کارنس پر سجانا ہے۔"

پھر امی نے خالو کے ڈر سے اسے شام کی کلاسوں میں بھیجنا شروع کردیا۔ اس کو نہ باورچی خانہ پسند تھا نہ سلائی مشین' لیکن خالو کی بدولت اسے ان دونوں کا کورس مکمل کرنا تھا۔ خالو گرجتے برستے امی سے کہتے تھے۔ "اس سے گھر میں پکوایا کرو بیٹی! میں تمہارے بھلے کے لیے کہتا ہوں تمہارا دشمن نہیں۔"

اس نے ان کے لیے کبھی نہیں پکایا۔ بخدا ان سے بڑا اس کا اور کون دشمن تھا۔ وہ صرف امی کو بچپنے میں پالنے کا حق جتاتے تھے اور سسرال میں سے اپنا حصہ لیے بغیر آجانے پر اپنا حساب کتاب نہیں بھولتے تھے۔

فیروزہ اس کو برق رفتاری سے فریزر اور فرج کھولتے بند کرتے دیکھ کر باورچی خانے سے آئی اور جویریہ کے کانوں میں کچھ پھونکنے لگی لیکن جویریہ ہر فقرے کے جواب میں مونڈھا جھٹک دیتی۔ اسے اچانک کچھ خیال آیا۔

"جویریہ! ذرا میرے ساتھ کچن میں آؤ گی۔"

اسے فیروزہ اپنی صورت کی وجہ سے کچھ زیادہ پسند نہیں تھی۔ سفیر چچا کی ساری اولاد شکل و صورت میں پوری کی پوری اختری چچی پر گئی تھی۔ ہر وقت کھوجتی' شبہ کرتی نگاہیں۔ ادھر ادھر متحرک ڈیلے جیسے ابھی کوئی چوری پکڑیں گے' ابھی کسی کا راز فاش کریں گے۔ عیار مکار ماتھا۔

"ذرا یہ سلاد بنالو گی۔ وہ شخص بے چارہ اکیلا ہے اور زخمی۔ یہ وقت کسی پر بھی آسکتا ہے۔" جویریہ کا رنگ اڑ گیا۔

"میں بنالوں گی لیکن اندر نہیں جاؤں گی۔" یہ شرم و حیا تو نہیں تھی یہ تو صاف گریز تھا' خوف تھا۔ آخر جویریہ اپنے منگیتر سے کیوں بھاگتی ہے۔ فیروزہ کا چہرہ چمکا۔ وہ اپنی ماں کو کوئی روداد سنانے چلی گئی۔ بڑی آپا ظہر کی نماز سے پہلے والا وظیفہ کر رہی تھیں۔ پھوپھو شمسہ برآمدے میں ڈھیر سارا ساگ پھیلائے درانتی انگوٹھے میں دبائے بیٹھی تھیں۔

اس نے ٹرے کا تھ سجایا۔ سیون اپ اور گلاس رکھا' کیچپ نکالی۔ کانٹا اور چھری نیپکن پر سجایا۔ میونیز ساس میں کٹی ہوئی بند گوبھی ڈال کر اس نے ہوٹل والے سارے حربے ایک ٹرے پر آزما لیے۔ وہ ان سب کے درمیان سے گزری تو سبھی متوجہ ہوگئے جانے وہ کامیاب پلٹتی ہے کہ ناکام۔

وہ دوڈھائی بجے اس کے پُرسکون کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اسی کا منتظر تھا۔ اٹھ کے بیٹھ گیا۔

اقصیٰ ڈرامائی انداز میں داخل ہوئی تھی۔ پہلے اس نے موم بتی جلا کر ٹرے میں رکھی سائیڈ پر رکھا لیمپ جلایا اور مین لائٹ آف کردی۔ وہ حیرت سے اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں اس نے ہوٹلوں والا سارا ماحول پیدا کردیا۔ وہ دراصل اس کا مسئلہ سمجھ چکی تھی لہٰذا ناکام پلٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے برق رفتاری سے پلیٹ صاف کردی تھی حتیٰ کہ ایک ایک چپس بھی۔ اس نے ٹرے میں رکھی ایک ایک چیز کا استعمال کیا تھا۔ نیپکن سے منہ صاف کرنے کے بعد وہ معصوم بچوں کی طرح اس کا بڑا ممنون اور مشکور سا لگ رہا تھا۔

"رات کے لیے؟"

"شرمندہ نہ کیجیے۔"

"پھر بھی پلیز۔ کوئی سوپ ہی بتادیجیے۔"

وہ مستعد بیروں کی طرح اگلا آرڈر اور پچھلے برتن اٹھا کر باہر آگئی۔ فیروزہ' بڑی آپا کے تخت پر بیٹھی چھالیوں کی کلھیا سے سفید نرم گودا چن چن کر کھا رہی تھی۔ سہ پہر کو اس کے طالب علم بچے اس کے گرد جمع ہوجاتے تھے۔ اس کے ہاتھ میں سنہری دستے والی بید کی نرم چھڑی ہوتی۔ جس کا وہ بے دردی سے استعمال بھی کرتی جاتی۔ خدا جانے فیروزہ علم عام کرنے کی شوقین تھی یا بچوں کی پٹائی کی' اسے نرسری کے

پھول سے بچوں پر بھی ہاتھ اٹھاتے جھجک نہ آتی۔ وہ برتن اٹھا کر باہر آئی تو بچہ اپنا قاعدہ فیروزہ کے گھٹنے پر کھولے انگلش کا سبق لے رہا تھا۔ فیروزہ نے معنی خیز انداز میں ایک مرتبہ اقصیٰ کو دیکھا۔ دوسری مرتبہ جو یریہ کو اور بلند آواز میں نرسری رائمز پڑھنے لگی۔

Lady bird lady bird
Fly asay home
Your house is on fire

جو یریہ بوکھلا گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی اقصیٰ کو کسی گندے کھیل میں الجھائے۔ بڑی آپا کا تخت خالی ہو چکا تھا۔ شاید اس وقت وہ اسٹور کی جھاڑ پونچھ کرانے اٹھی تھیں۔ فیروزہ انجان بنی دیر تک ان کی تسبیح' ان کا بٹوہ' ان کے جزدان سے الجھتی رہی۔ پھر بڑی آپا کے آنے پر معتبر سی ہو کر پڑھانے بیٹھ گئی۔

"طلحہ نے کھالیا۔" انہوں نے آتے ہی پوچھا۔

"بھلا گائے کے گوشت سے کبھی زخم بھرتے ہیں۔ خیر مرضی اس کی پیٹ تو بھرے کسی طرح۔ یہ کم بختی ماری ڈاکٹروں کی ٹکیہ تو خالی پیٹ کلیجہ کھسوٹتی ہے۔"

یہ ایک ویزا تھا۔ اس کے بعد اقصیٰ نہایت سنجیدگی سے کارڈ لے کر جاتی اور ہنستے مسکراتے اس کا آرڈر پہنچاتی۔ ان کے مابین رابطے برھاتی یا بے تکلفی پیدا کرتی کوئی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو ڈھنگ سے جانتے بھی نہیں تھے۔ لیکن اقصیٰ کی اتنی فتح کافی تھی کہ مریض کھانا خوشی سے کھالیتا تھا۔ برتن اٹھا کر سر پر نہیں مارتا تھا۔ صرف ایک مرتبہ اس نے چائے کی فرمائش کی ورنہ اقصیٰ کو لگنے لگا تھا وہ کسی ہوٹل کی مالکہ ہے اور طلحہ اس کا مستقل گاہک۔

وہ اس رات کا کھانا لے کر ہمیشہ کی طرح شگفتگی سے داخل ہوئی لیکن وہ روز کے موڈ میں نہیں تھا۔ اقصیٰ سہم گئی۔ وہ کچھ سوچتا' کچھ الجھتا لگ رہا تھا۔ جیسا اس نے اس بیماری کے ابتدائی دنوں میں دیکھا تھا۔ وہ شاید امتحان میں فیل ہونے والی ہے' کہیں اس کی یہ چادر ادھوری نہ رہ جائے۔

اس نے پسپائی تو تسلیم نہیں کی تھی۔ وہ کھانے لگانے میں اپنا مخصوص اہتمام کرنے لگی اس طرح کہ اسٹیل کی یہ مریضوں والی بے ہودہ سی ٹرالی بھی جگمگا اٹھی۔ اس نے عادتاً" کھانے کے ساتھ موم بتی جلائی ۔لیمپ روشن کیا۔ لائٹ آف کر کے وہ واپس جانے والی تھی کہ طلحہ کی تھکی تھکی آواز نے دروازے تک اس کا پیچھا کیا۔

"سنیے یہ لائٹ جلا دیجیے ۔مجھے ڈاکٹر نے ہر وقت مناسب روشنی رکھنے کے لیے کہا ہے۔"

اقصیٰ نے بے اعتباری سے دیکھا۔ لائٹ جلائی۔ لیمپ آف کیا اور موم بتی کو پھونک مارنے کے لیے جب وہ اسٹیل کی ٹرالی پر جھکی تو طلحہ نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔

"لگتا ہے مہمان نوازی کے دن تمام ہوئے۔"

"وہ کیسے؟" اس نے موم ٹپکتی ہوئی موم بتی چاولوں کی پلیٹ کے پاس سے اٹھالی۔

"آپ بیزار بیزار۔ تھکی تھکی لگ رہی ہیں۔" وہ بیزار تو نہ تھی۔ صرف اس کے رویے سے مایوس ہو گئی تھی۔ اقصیٰ حیران رہ گئی۔ اس نے پلک جھپکتے اس کا چہرہ پڑھ لیا تھا' وہ وجہ جاننے سے قاصر تھا لیکن جذبوں کو سمجھ لیتا تھا۔ کیا یہ شخص ہمیشہ سے اتنا حساس اور انسان دوست رہا ہو گا۔ یا وقت کے دیے گھاؤ نے اس کی شخصیت اس بجھی ہوئی موم بتی کی طرح ملائم اور نرم کر دی تھی۔

"میں تھک ضرور گئی ہوں لیکن بیزار نہیں ہوں۔"

"شکر ہے اللہ۔" اس نے چھت کی طرف سر اٹھایا۔

"ورنہ باہر کی دنیا میں بالکل بھول جاتا۔ آپ کے سہارے پہلے کچھ بتانا ہے۔ پھر کچھ پوچھنا ہے۔ پتا نہیں آپ پر بھروسا کر سکتا ہوں یا نہیں۔" بات تو سنجیدہ تھی لیکن وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ خوشی سے تمتمانے لگی۔ وہ اسکول گرل نہیں تھی لیکن اپنی ذات کی اتنی اہمیت اسے مالا مال کر گئی۔

"آپ دیکھیں گے کہ آپ نے غلط آدمی پر بھروسا

نہیں کیا۔"

"گڈ' اعتماد بھی تو وقت کے سہارے آتا ہے۔ اتنا وقت گزرا ہے اور گزر جائے گا۔" وہ کانٹے چمچ کے کھیل میں مصروف رہا۔ "آپ نے کتنا پڑھا ہے؟ میٹرک' ایف اے؟ میرا مطلب۔"

اقصیٰ نے اسے بے طرح شرمندہ ہوتے دیکھا' اپنے سوال کے بھونڈے پن کا اسے خود احساس ہو گیا تھا۔ پہلا حصہ ہی کافی تھا قیاس آرائیاں عموماً" مخاطب کی دل آزاری کا سبب بنتی ہیں۔

لیکن وہ تو مسکرانے لگی۔ "جی میٹرک' ایف اے' بی اے بھی اور ایم اے بھی کر رہی ہوں فائنل ہے۔"

وہ خلاؤں میں جیسے نابود ہو گیا۔ "یا یعنی؟" وہ اتنے واضح فقرے کا مفہوم نہیں سمجھ پا رہا تھا یا صورتِ حال کو سنبھالا نہیں دے پا رہا تھا۔

"ہوں' دیکھیے تو صاف آپ کی گفتگو سے پتا چلتا ہے لیکن دراصل پہلی ملاقات میں' میں نے خود سے سوچ لیا تھا آپ کی تعلیم کے بارے۔"

رات کو سونے سے پہلے اس نے ہنس ہنس کر جویریہ کو روداد سنائی۔ وہ اپنی مرضی سے جویریہ کے ہی کمرے میں رہتی تھی۔ بڑی آپا نے بہت مرتبہ کہا بھی کہ وہ ان ہی کے کمرے میں آجایا کرے۔ لیکن اقصیٰ ڈسٹرب ہوتی تھی۔ وہ رات کو وقت بے وقت بتی جلا لیتیں اس طرح ان کی نیند اچاٹ ہو جاتی۔ جاگتی تو جویریہ بھی رہتی تھی لیکن لائٹ آف کر کے سائیڈ لیمپ جلا لیتی۔ وہ واپس آکر اوندھے پڑتی اور وہیں سو جاتی۔ اس دن بھی چند منٹ سونے کے بعد اچانک اسے یاد آگیا۔ وہ ہنستی ہوئی اٹھ گئی۔

"طلحہ بھائی سمجھتے ہیں میں میٹرک' ایف اے پاس ہوں' جویریہ کیا میں شکل سے واقعی ایسی لگتی ہوں۔"

جویریہ روانی میں کچھ لکھ رہی تھی۔ لکھتے لکھتے چونک گئی۔ "تم سوتی کیوں نہیں ہو؟" اس کی آواز کی جھلاہٹ اقصیٰ کو چبھ سی گئی۔ یہ آواز یہ لہجہ اسے خالو جان کی یاد دلا گیا۔

بیزاری تھکن' چڑچڑاپن وہ پیار سے کسی سے نہیں بول سکتے تھے اپنی اولاد سے بھی نہیں۔ ان کے خیال میں یہ لہجہ ان کا حق تھا۔

"تم مجھ سے اکتا گئی ہو۔"

"نہیں موربڈ نہ بنو۔"

"یہ تمہارے گھر میں بڑا بھاری طعنہ ہے۔ موربڈ نہ بنو۔ کون تمہارے گھر میں غم والم کا مارا نہیں۔ ایک سے ایک بڑا قنوطی... تاریک پہلو دیکھنے والے اور تم' تم خود کیا ہو۔" وہ بستر سے اتر آئی۔ "تم وہی ہونا جس نے اپنا منگیتر صرف اس لیے چھوڑ رکھا ہے کہ وہ اپاہج ہے اور فی الحال اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ چل بھی سکے گا۔" غصے میں نکلی اس کی ذرا بلند آواز سے جویریہ کے سناٹے نکل گئے۔

"اقصیٰ! تمہیں حالات کا تو پتا نہیں۔ تم ایسے ہی۔" وہ دہشت سے سفید ہو گئی۔ "یہ اس وجہ سے نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔ میں خود تمہیں کسی دن۔ تم جا کہاں رہی ہو۔" وہ تکیے اٹھا کر جاتی اقصیٰ کے پیچھے لپکی۔ بڑی آپا اسے پل بنانا چاہتی تھیں۔ جو دو شہروں کے درمیان راستوں کی طوالت کو مختصر کرے۔ وہ ننھیال اور ددھیال کے دونوں کناروں کے لیے وفادار تھی لیکن ان میں سے کسی کا بھی حصہ نہیں تھی نہ نانا کے گھر میں۔ نہ دادا کے گھر میں۔

"مجھے گرمی لگ رہی ہے۔" اس نے بے سبب سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "میں باہر سوؤں گی۔"

ہر صبح بڑی آپا کے ہاون دستے سے ہوتی تھی۔ وہ ہر چیز ہاون دستے میں کوٹ کوٹ کر سرمہ کر دیتیں۔ ان کا خیال تھا اس طرح مسالوں میں نفاست آجاتی ہے۔ ان کا بس چلتا تو اسی فارمولے سے انسانوں کو بھی نفیس بنا دیتیں۔ وہ آدھی کچی' آدھی پکی نیند میں ان کے صحن میں بچھے تخت پر آجاتی' صحن میں ہلکی ہلکی تازہ ہوا ہوتی۔ شیشم کے درختوں پر پتے ہوا میں ننھے بچوں کی طرح تالیاں بجاتے۔ فرحت بخش ہلکی ہلکی ہوا میں اتنا سرور ہوتا کہ وہیں تخت پر ایک کونے میں آڑھی ترچھی ہو کر پڑ جاتی۔ مکھیاں کبھی پاؤں پر تنگ

کرتیں۔ کبھی کان میں آکر بھنکتیں۔ وہ وہیں پڑے پڑے پاؤں ہلاتی رہتی اور رات کی ضائع شدہ ساری نیندیں پوری کرتی۔ بڑی آپا کو اس کی ساری عادتوں سے پیار تھا۔ صرف یہ نیند والی ادا نہیں بھاتی تھی۔

"اب اٹھ بھی چکو اقصیٰ! دن چڑھ آیا ہے' ہے نا عجیب بات کہ ننھیال میں کسی نے بچے کو اچھی بری بات پر ٹوکا نہیں۔"

اسے اب اس قسم کے طعنے چبھتے نہیں تھے۔ وہ یہاں ہوتی تو وہاں کی باتیں سنتی۔ وہاں چلی جاتی تو دن رات بڑی آپا کی شان میں تیار شدہ ہجو اس کے گوش گزار ہوتی۔ وہ اونگھتی جھلاتی اٹھتی اور کسی اور کے بستر پر لڑھک جاتی۔ شمسہ پھوپھو کہتی تھیں۔

"سونے دیں اماں۔ سال بھر کی نیند انہی دنوں میں تو بچے پوری کرتے ہیں۔"

اس دن وہ طلحہ کے پاس گئی تو وہ کتابیں سمیٹ کر چپ چاپ بیٹھا تھا اور افسردہ لگ رہا تھا۔ اقصیٰ اسی کے نزدیک چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔

کتابیں سلیقے سے رکھ دی تھیں۔

بوتل ہٹادی تھی۔

"بام و در پہ نیا رنگ و روغن کیا تھا۔ لیکن اس کی وجہ؟" اس کی ساری افسردگی پہلی مسکراہٹ ہی میں دھل گئی۔

"ڈاکٹر صاحبان فرماتے ہیں۔ جب تک سیدھا نہ بیٹھوں' مجھے کتابوں کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔ ورنہ میری بینائی بھی جاتی رہے گی۔"

"جی؟" اس نے آہستگی اور حیرت سے دہرایا۔

"ہاں ہاں بھلی بی بی! بینائی بھی علاوہ ٹانگ کے۔"

وہ چپ ہو گئی۔ وہ اس سے اس کی بیماری کے موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ کیا فائدہ' یہ بڑا تکلیف دہ موضوع تھا' وہ اس سے بھاگتی تھی۔ خاص طور پر جب مریض ترس کھانے سے اکتاتا ہو اور کیا جانے خلوص سے کہی گئی بات کو وہ کس کھاتے میں ڈال دے۔ بیماری کے موضوع پر جب بحث چلتی۔ وہ خود ہی چھیڑتا' خود ہی چپ ہو جاتا۔

"لائیے میں پڑھتی ہوں۔" اس نے کتاب الٹ پلٹ کر دیکھی Thorn Birds تھی۔ یہ کسی کا تحفہ تھی۔ دینے والے نے اپنے ہاتھ سے اس پر لکھا بھی تھا۔ "اچھے دنوں کی یاد کے لیے۔ ایم" کوئی پرانی سی تاریخ درج تھی۔ اس سے نیچے کسی دوسری تحریر میں شیلے کی ایک لائن تھی۔

the thorns of life i bleed

I fell upon

اس لائن کے نیچے آج کی تاریخ تھی اور طلحہ زیر لب دہرا رہا تھا۔ "میں خارزار حیات میں گھرا' لہو لہو ہوں۔" اس نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی جو جانے کون سے کارزاروں میں الجھ گیا تھا۔ اس نے کتاب کھولی۔ نشانی کا کاغذ ہٹایا اور تسلسل سے بہتے پانی کی سی روانی سے کتاب پڑھ کر سنانے لگی۔ وہ کتاب سن رہا تھا یا نہیں' دل کھول کر اس کا جائزہ لیتا رہا۔ میل نرس انجکشن لگانے آتا یا دوا کی یاد دلاتا۔ تو کچھ دیر کے لیے تسلسل ٹوٹ جاتا اور پھر وہی اب کھانا پکانے کے علاوہ۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر سنانا بھی اس کی ڈیوٹی میں شامل ہو گیا۔ وہ اسے ایک ناگوار بوجھ بنانے سے بچنے کے لیے اپنی من مانیاں کرتی۔ وہ بیسٹ سیلر (Best sellers) کے خلاف تھا' خاص طور پر "ڈینیل سٹیل" کے لیکن وہ ضد میں آجاتی اور پوری کتاب سنا کر ہی دم لیتی تھی۔

اس دن ناول نہایت دردناک موڑ پر آیا ہوا تھا۔ لڑکی کی شادی اس کے باپ نے اپنے بوڑھے دوست سے کر دی تھی۔ اقصیٰ کی آواز میں جوش تھا لیکن ٹھنڈا پڑ گیا۔ جیسے جلتے ہوئے انگاروں پر پانی کا چھینٹا مار کر بجھا دیا جائے۔

"ٹیلی فون میرے کمرے تک آسکتا ہے؟" طلحہ پوچھ رہا تھا۔

"میں دیکھ کر بتاتی ہوں۔" وہ کتاب بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سیدھی چچا منیر کے کمرے میں پہنچی۔ لیڈ کھینچ کر دیکھی' وہ مشکل سے کمرے کے دروازے تک آتی تھی۔ طلحہ کے کمرے میں لے جانے کے

لیے ایسے چھ عدد تار اور چاہیے تھے۔ چچا منیر نے اسے آتے' ولولے سے تار کھینچتے پھر مایوس ہوتے دیکھا۔

"کیا بات ہے بٹیا؟"

لیکن بٹیا اتنی دیر میں طلحہ کے کمرے میں پہنچ چکی تھی۔ "جی نہیں تار بہت چھوٹا ہے۔"

اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ بہت دیر تک وہ انگلیاں ماتھے سے رگڑتا رہا۔ جیسے ماتھے سے اپنا دکھ کھرچ رہا ہو۔

"اچھا۔" مسکرانے کی ناکام کوشش اسے مضمحل سا بنا رہی تھی۔ "یوں کریں۔ آج آپ کے اعتماد کا امتحان ہے' اس نمبر پر فون کریں اور ذرا پتا کر کے بتائیں کہ مصباح نامی خاتون کے احوال کیا ہیں۔ کیا وہ زندہ ہیں اور کہاں ہیں؟"

وہ محاورے نہیں بول رہا تھا' ان کے لغوی معنی استعمال کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ روشنی کے ہالے میں تھا۔ فتح و محبت کی روشنی' حصول کی روشنی۔ امید کی روشنی۔

اور اقصیٰ تاریکی میں ڈوب گئی۔ صحیح کہتی تھی جویریہ اسے حالات کا ذرا نہیں پتا۔ وہ خوامخواہ اس سے لڑی اور اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ لاڈلے بگڑے بچوں کی طرح اس کی فرمائشیں پوری کرے۔ وہ اسی کا بگاڑا ہوا تو تھا۔

سارا دن منیر چچا مہ رخ کو اپنے کمرے میں لیے سائیکالوجی پڑھاتے رہے۔ وہ جتنی دفعہ کمرے میں گئی۔

"نیوروسس' نیوروسس۔" وہ اسی موضوع پر اٹک گئے تھے۔ اگر اسی طرح اٹکے رہے تو وہاں بے چین طلحہ کا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔ وہ ہر پھیرے پر پوچھتا۔ "بات بنی کچھ۔ کیا فون۔" پھر وہ شبہ کرنے لگتا۔ "آپ کا ارادہ ہی نہیں۔" نیت پر شک کیا جانا اسے ہمیشہ برا لگتا۔

رات کو پونے گیارہ بجے وہ فون کر سکی۔ اس نے نمبر ڈائل کیا۔ پیغام ریسیو کیا اور بے قرار طلحہ کے کمرے میں گیارہ بجے ہی آ گئی۔ وہ اب تک جاگ رہا تھا اور شدّت سے اس کا منتظر۔

"جی' ریسیو کرنے والی خاتون نے کہا۔ وہ سو رہی ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ۔ زندہ بھی ہیں۔" وہ ہچکچائی۔

"لیکن آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ۔" طلحہ جس بے تابی سے بولا تھا اسی بلبلے کے پھٹ جانے والے انداز میں ٹھنڈا پڑ گیا۔

"اور کچھ میں نے آپ سے کہا بھی کب تھا۔"

اس نے تکیے کے نیچے سے ٹٹول کر سگریٹ نکالی' ماچس کا شعلہ اس تیزی سے سگریٹ کی طرف لپکا جیسے اب یہی اس کی آخری پناہ گاہ رہ گئی ہو۔

"ہے تو نا جائز سی بات۔" اس نے مایوس سا مضمحل سا سر اٹھایا۔ "لیکن آپ اس وقت چائے بنا سکتی ہیں۔ کمرے میں سب سامان موجود ہے۔"

اس نے لیٹے لیٹے شیلف کی نچلی دراز گھسیٹی۔ چابی اٹھا کر اس کی طرف اچھال دی۔

"یہ وارڈ روب کھولیں۔ دائیں ہاتھ پر سب کچھ مل جائے گا۔" وہ اتنی ذہین ضرور تھی کہ اس نے سمجھ لیا کہ اسے دائیں طرف کے سوا اور کہیں نہیں دیکھنا۔ الیکٹرک کیتلی' سوکھا دودھ۔ ٹی بیگز' چینی مگ اسے سب کا سب واقعی دائیں طرف ایک ہی جگہ رکھا نظر آ گیا۔ محض اتفاقاً" ہی اس کی نگاہ بائیں طرف اٹھ گئی۔ وہاں ایک دوپٹہ جس پر باسی سرخ رنگ کے دھبے اور ایک زنانہ جوتا۔ ایک پولی تھن کے تھیلے میں پیک ہوئے رکھے تھے۔ وہ الماری بند کر کے پریشان ہو گئی۔

غیر اختیاری طور پر اس کی نگاہ ایکسیڈنٹ میں تباہ ہونے والی گاڑی پر پڑی۔ جائے حادثہ سے طغرل اسے گھسٹوا لائے تھے اور اب وہ اتفاق ہی تھا کہ طلحہ کے کمرے کے عین سامنے چکنا چور حالت میں کھڑی تھی۔ یہ دوپٹہ اور جوتا جویریہ کا یقیناً" نہیں تھا پھر یہ سب کچھ کس کا تھا۔ غالباً" اس کا جو بیمار آدمی کی نیندیں اچاٹ کر کے خود کن کی نیند سو رہی ہے۔ اگر طلحہ کو اس سے عشق ہے تو وہ اس سے ملنے کیوں

نہیں آتی اور طلحہ اس کے سلسلے میں اتنا بے چین کیوں ہے۔

"کتنی چینی؟" اس نے پوچھا لیکن جواب نہیں سنائی دیا۔ وہ ابھی اسی نکتے پر اٹکی ہوئی تھی۔ ابلتا ہوا پانی نئی بیگز پر انڈیل کر مگ اس کے نزدیک رکھ آئی۔

"اور آپ' آپ نہیں پئیں گی یہ تو بہت بری بات ہے۔" وہ خاموشی سے اپنا مگا بھی اٹھا لائی۔

"کسی نے فون تو نہیں سنا۔ یقیناً" میں نے آپ کو اعتماد کے لیے صحیح چنا تھا اور سوچیے میں آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ سوائے اس نیک اور مخلص سی روح کو جو آپ کے اندر ہر وقت بیدار رہتی ہے۔ ویسے یہ بھی میرے لیے کافی ہے۔"

اس کی آنکھیں تشکر اور ممنونیت سے گیلی گیلی سی تھیں۔ سلگتی ہوئی۔ اس کو وقت بے وقت اٹھنے بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن وہ کسی اچانک امڈ آنے والے احساس تشکر سے لبریز ہو کر سیدھا ہو گیا۔

"آپ کم گو ہیں۔ اچھے لوگوں کی طرح بولتی تھوڑا ہے اور یہ تھوڑا بولا کسی کو اذیت نہیں دیتا لیکن پھر بھی کبھی خاموش بیٹھ کر آپ کا خیال کرتا ہوں تو آپ کا کوئی فقرہ۔ کوئی رائے کوئی تبصرہ۔ ذہن میں کچھ بھی نہیں آتا۔ چلیے آج آپ کا دن ہے۔ آپ بولیں گی اور میں سنوں گا۔ موضوع کا انتخاب آپ پر چھوڑتا ہوں۔"

وہ مسکرا دی۔

"مسکراہٹ بھی اچھی چیز ہے۔ لیکن کچھ کہیے بھی تو' اچھا بڑی آپا سے آپ کا تعلق؟" اس نے قیاس لگانے سے گریز کیا۔

"وہ میری دادی ہیں۔"

"کیا مطلب؟ آپ کی دادی۔ آپ۔"

"میں اپنی امی اور خالہ کے ساتھ اپنی ننھیال میں رہتی ہوں۔ لاہور اب چھٹیوں میں بڑی آپا سے ملنے آتی ہوں۔"

"اچ' چھا' اچھا۔" اسے یاد آگیا تھا۔ "ٹھیک ہے۔ ہاں' ہاں میں نے پہچان لیا۔ میں نے دیکھا تھا آپ کو ماموں کی وفات پر۔ تب آپ بہت چھوٹی تھیں' لیکن آپ نے مجھے تب بھی بڑا سخت متاثر کر ڈالا تھا۔ اتنا کہ خیر آپ کی مزید تعریف آپ کو بگاڑ دے گی لیکن آپ کہاں چلی گئیں پھر۔ اس کے بعد میں نے نہیں دیکھا۔"

یہی تو وہ موضوع تھا۔ جس سے وہ بھاگتی تھی۔ بچ بچ کر اور ہر چوراہے پر اسے یہی موضوع گھیر لیتا تھا۔ اس نے اس کے چہرے پر تکلیف کے سائے ڈولتے دیکھے اور بغیر کہے موضوع بدل دیا۔ اب وہ اپنے پرانے حادثات کی کہانیاں سنا رہا تھا۔ مزے لے لے کر خوش ہو کر۔

وہ حیران رہ گئی۔ یہ شخص آہستہ آہستہ کتنا بدل رہا تھا۔ وہ مسکراتا بھی تھا۔ اداس بھی ہوتا۔ لوگوں کی تعریف کرتا تھا' اپنی سننا چاہتا تھا۔ نارمل جذبوں کے مالک کے لیے یہ کتنا ضروری ہے۔ وہ اب اسے بہت زیادہ سمجھ گئی تھی۔ سارا دن جس شخص پر سستی اور کاہلی طاری رہتی تھی۔ جو سارا سارا دن اپنی زخمی ٹانگ کو پالے ہوئے طوطے کی طرح گھورتا رہتا تھا۔

وہ اسے ہنس ہنس کر بیروت کا ایک واقعہ سنا رہا تھا جب اس کے ہوٹل کے باہر بم پھٹ رہے تھے۔ اس کا غسل خانہ دھماکے سے ادھ موا ہو گیا لیکن یہ وہی تھا جو بال بال بچ کر باہر نکل آیا تھا۔

اس نے چپکے سے نگاہ اٹھا کر کلاک کی طرف دیکھا۔ اف توبہ ایک بج کر چالیس منٹ ہو گئے تھے۔ تب ہی تو اتنی نیند آرہی ہے۔ اس نے دانت دبا کر جمائی روکی۔ مبادا وہ برا مان جائے لیکن اس کی نظر اقصیٰ کی آنکھوں میں نیند سے تیرتے آنسوؤں پر پڑ گئی۔

"اس کا مطلب ہے میں آپ کو بور کر رہا ہوں۔ اچھا جائیے اور سوئیے۔ پھر کسی دن تفصیل سے گفتگو کریں گے۔"

اس کا دل چاہا اسے سمجھائے کہ رات کے پونے دو بجے کو "دن" تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا لیکن پھر وہ وقت کے فلسفے میں الجھ جاتا۔ لہٰذا اس نے اٹھنے ہی میں

عافیت جانی۔ وہ سیدھی بھی نہ ہو پائی تھی کہ دروازے کی ناب گھومی اور اختری چچی نے اندر قدم رکھا۔

ان کے ڈیلے ایک ایک کونے میں گردش کر رہے تھے' وہ پراسرار سی لگ رہی تھیں۔

"ہاہ' میں نے سوچا بچہ اکیلا ہو گا دیکھ آؤں۔ یہاں تو بچہ محفل سجائے بیٹھا ہے۔" وہ طنز کی شدت کو کم کرنے کے لیے زور زور سے ہنسنے لگیں کہ کسی کے لگ جائے تو ٹھیک نہ لگے تو یہ تو کہہ سکیں کہ انہوں نے مذاق کیا تھا لیکن لگی بڑی مناسب تھی۔ اقصیٰ کانپ گئی۔ وہ اٹھ کے تو کھڑی تھی۔ جانے لگتی تو اختری چچی خوش ہو جاتیں کہ وہ ان کو خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ اس کا دل صاف ہونے کے باوجود اختری چچی کے دم خم دیکھ کر پنڈولم کی طرح لرز رہا تھا۔

"میں تو پریشانی میں ہول گئی۔ کتنی دیر سے بتی جلتی بجھتی دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا دیکھ کر تو آؤں۔ طلحہ غریب تنہا پڑا ہے۔ جانے کس چیز کی ضرورت ہو' کیا مانگتا ہو۔" موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے سے ان کی پتلیاں پھر شیطانی رقص کر رہی تھیں۔ وہ صاف بہتان باندھ رہی تھیں۔

"جی ہاں چائے کی ضرورت تھی۔ انہوں نے بنا دی ہے۔" وہ ایسے مطمئن تھا۔ پرسکون جیسے یہ سب کچھ روزمرہ سے مختلف نہ ہو۔ وہ دیر تک بدلتی صورت حال کا مزا لینے کے بعد واپس چلی گئیں۔

طلحہ نے سر جھکا کر بیٹھی اقصیٰ کو غور سے دیکھا۔

"میں نے دانستہ یہ سلوک کیا ہے۔ میں بدتمیزی بھی کر سکتا تھا لیکن اس سے وہ زیادہ خوش ہوتیں۔ وہ چاہتی یہی تھیں۔ یہی کرنے بھی آئی تھیں۔ آپ معصوم ہیں۔ آپ کا یہ بہت کچھ بگاڑنا چاہتی بھی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے ان کو من مانی کرنے کی آزادی ہے جس کا دل چاہے۔"

"اچھا اب تلخ نہ ہوئیے۔" وہ دھیمے بول رہا تھا تاکہ آواز کی نرمی اس کا غصہ ٹھنڈا کر دے۔ "پلیز آپ نئی ہیں بہت سی سیاستوں سے آگاہ نہیں۔"

"اچھا آپ مصلحت پسند ہیں؟ زمانے کے ساتھ ساتھ ڈھلنے والے۔" جو کچھ وہ اختری چچی کو نہیں سنا سکی دل کی بھڑاس لیٹے ہوئے آدمی پر انڈیلنے لگی۔ وہ بیمار تھا۔ زخمی تھا کمزور تھا لیکن کیا اتنا ناکارہ تھا کہ کسی کی حفاظت بھی نہیں کر سکتا تھا یا اختری چچی اتنی زور آور تھیں کہ وہ لوگوں کے دل دہلا دیتی تھیں۔

باہر رات تاریک تھی۔ جویریہ کے کمرے سے روشنی کی موٹی سی لکیر باہر نکل رہی تھی۔ اس مدھم روشنی میں اس نے راستہ بناتے سوچا۔ بڑی آپا... بڑی آپا کیا سوچیں گی۔ اگر اس رائی کا پربت ان کے کانوں میں پھونکا گیا تو وہ کس قابل رہ جائے گی۔ ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔

اس نے آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھولا' لیمپ جل رہا تھا' لیکن جویریہ اپنے بستر پر سو رہی تھی۔ لیمپ شاید اس کی رہنمائی کو ہی جلتا چھوڑا گیا تھا۔ وہ بھی اپنے تکیے درست کر کے بے شکن چادر عادتاً جھٹک کر لیٹ گئی۔ جویریہ میں بڑی آپا کا سارا سلیقہ نچڑ کر آ گیا تھا۔ وہ بجلی بند کرنے سے پہلے کمرے کا ذرہ ذرہ چمکا کر سوتی تھی۔

"اگر جویریہ۔" اسے پہلی مرتبہ اس خوفناک ناگ نے ڈسا۔ "اگر جویریہ بھی اس پر شبہ کرنے لگے' اس کے پاس کیا بچے گا؟"

وہ لوگوں کو کیا سمجھائے گی۔ اللہ کے نام پر دوستی اور خدا ترسی بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس نے بچپن میں حدیث پڑھی تھی۔ "جو خدا کے نام پر لوگوں سے محبت کرے گا' خدا اس سے محبت کرے گا۔" اقصیٰ کا باپ نہیں تھا۔ بہن بھائی نہیں تھے' لے دے کے ایک ماں ہی تھی۔ وہ بھی توہمات کا شکار۔ ناراض' بدگمان جنہیں پورا یقین تھا کہ اقصیٰ نے ددھیال والوں کی خوشامدیں کر کے ان کے عمر بھر کی تربیت کا ناس مار دیا ہے اور یہ کہ ان کی ساس دراصل اقصیٰ کو ان ہی کے خلاف استعمال کرنے کو تیار کر رہی ہیں۔ اسے محبتوں کی ضرورت تھی۔ وہ بھی اپنا نام ان لوگوں کی فہرست میں لکھوانے کی شوقین تھی۔ جن سے

خدا خود محبت کرتا ہے۔ اب اگر اختری چچی کے خوف سے خدا ترسی ہی چھوڑ دی جائے تو سوچو طلحہ بے چارے کا کیا بنے۔ اس کا قصور ہی کیا ہے، جو لوگوں نے اسے یوں راندۂ درگاہ کر چھوڑا ہے۔ اس بے دردی سے تو انسان پرانا فرنیچر بھی نہیں ڈالتا۔ اسے بڑی آپا کی کوٹھری یاد آگئی جس میں کاٹھ کباڑ بھرا تھا۔ لیکن ترتیب سے سلیقے سے۔

اچانک اس نے کمرے میں ایک ہلکی سی گونج سنی۔ ایک ارتعاش۔

شاید جویریہ کو پتا نہیں چل سکا۔ وہ آگئی ہے وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ رو رہی تھی۔

کہیں جویریہ اسے کمرے میں موجود نہ پا کر تو نہیں رو رہی تھی۔ اس کے یہ تو علم میں ہی ہو گا کہ آخر اقصیٰ اور کہاں جا سکتی ہے۔ وہ کانپ گئی۔ "جویریہ جویریہ!"

اس نے کئی مرتبہ جویریہ کو پکارا۔ جویریہ افشائے راز سے ساکت ہو گئی تھی۔ وہ اقصیٰ کو بتانا چاہتی تھی، میں سو رہی ہوں۔ اقصیٰ کے لیے یہ رات سہم سے بھری ہوئی تھی۔ آنے والا دن اس کے لیے بلیک وارنٹ... لا رہا تھا۔ صبح کہ جس کے آنے میں اب چند گھنٹے ہی رہ گئے تھے۔ لیکن لیکن وہ آنہیں پا رہی تھی۔ بڑی آپا کے نرم سلیپروں کی کھسر کھسر برآمدوں اور غسل خانے میں سنائی دے رہی تھی۔ کبھی نلکا چلنے کی آواز آتی۔ کبھی تخت گھسٹنے کی، وہ غالباً "تہجد کے لیے اٹھی تھیں۔ اس گھر میں اس کی عزت کا انحصار محض اختری چچی کے بیان پر ہو گا۔ اس کی امی اور خالہ ان دونوں میں سے کوئی لحاظ نہیں کرے گا۔ خالو تو کئی مرتبہ وارننگ دے چکے تھے، عزت اور زندہ گاڑ دینے کے سلسلے میں۔ نانا کے انتقال کے بعد خالو نے نہایت آسانی سے ان کی دھمکیاں اپنے منہ میں ڈال لی تھیں۔

"جان سے مار دوں گا۔ زندہ گاڑ دوں گا۔ خبردار جو منہ سے ایک ایک لفظ بھی پھوٹا ہو تو۔"

ایک دادی کا گھر غنیمت تھا۔ صبح کے ساتھ وہ بھی چھن جائے گا اور جو کسی نے تفصیلات میں نمک مرچ چھڑک کر امی کو لکھ بھیجا تو اس کی حیثیت دھوبی کے کتے سے زیادہ کیا ہو گی۔ کسی سے بھلائی کرنے کا ایسا بد اجر بھی ملتا ہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

وہ جانے کب سوئی اور کب اٹھی۔ سب ناشتا کر کے اپنے اپنے کاموں کو جا چکے تھے۔ دھوپ کمرے میں آ رہی تھی وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور سیدھی بڑی آپا کے کمرے میں گئی، وہ ابھی سو رہی تھیں۔ وہ تہجد سے فجر تک نوافل پڑھتی تھیں اور ناشتے کے بعد سو جاتی تھیں۔ وہ چپ چاپ ناشتا کرنے رمضانو کے پاس آ گئی۔ باورچی خانے میں ایک نیچے پاؤں کی میز اور چھوٹی چھوٹی لکڑی کی کئی چوکیاں پڑی ہوئی تھیں وہ کونے والی چوکی پر بیٹھ کر بظاہر ناشتے کا انتظار کرنے لگی، لیکن دراصل وہ حالات کا انتظار کر رہی تھی۔ چائے دانی میں چائے ٹھنڈی اور تلخ تھی۔ دودھ پر ملائی کی موٹی تہہ آ گئی تھی لیکن اس نے ایک سانس میں سب کچھ غٹ سے چڑھا لیا، رمضانو انڈا فرائی کر رہی تھی۔

"ماں واری۔ اٹھ گئیں۔" اختری چچی کی نگاہ پڑی تو اس کے پیچھے لپکیں۔ "میں تو کہہ رہی تھی سب سے، شور نہ کرو۔ طوفان نہ مچاؤ۔ بچے رات کو دیر سے سوئے تھے۔"

اختری چچی اب اس کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ چوہا بھاگ بلی آئی۔ چوہا بھاگ بلی آئی۔

وہ رات والی بزدلی اب ختم ہو گئی تھی۔ اندھیرا انسان کو کمزور بنا دیتا ہے، اور خوف کے بھوت دیو ہیکل ہو جاتے ہیں۔ صبح کو وہی چیزیں آسان اور معمولی لگتی ہیں۔ منٹوں میں حل ہو جانے والی۔ بھلا اختری چچی حد سے حد اس کا کیا بگاڑ لیں گی۔ یہی نا کہ وہ آئندہ کے لیے طلحہ کی خدمت اور صحبت سے محروم ہو جائے گی۔ بھاڑ میں جائے طلحہ۔ وہ تو اس نے رات ہی سوچ لیا تھا۔ بلا سے وہ گھی کا شوربا پیے یا چولائی کا ساگ کھائے۔

سارا دن اس نے دھماکے سننے کے انتظار میں سرخندق میں دیے رکھا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔

اختری چچی نے کمال کر دیا بڑی آپا کا مزاج بتا رہا تھا' انہیں اختری چچی کے ارادوں کی سن گن بھی نہیں ملی۔ وہ ویسے ہی رہیں' خوش باش مہربان۔ وہ سر منہ لپیٹے تمام دن جویریہ کے کمرے میں گھسی رہی۔ جویریہ نے کتنے دنوں سے وال پینٹنگ شروع کی ہوئی تھی' لیکن ابھی تک شکل بھی نظر آنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ وہ سارا دن کراس اسٹچ گنتی رہتی۔ ڈارک بلیو سات' لائٹ بلیو تین اور یوں بڑی سہولت سے رات آ گئی۔ اگلا دن اور اگلی رات' اس طرح خوف کے آگ اگلتے لمحے اس نے بن حملے پار کر ہی لیے اور جویریہ کی مینار کی کھڑکیاں اور درختوں کی چوٹیاں اور آسمان مکمل ہو گئے۔ وہ جانتی تھی اختری چچی اس فتح کا جشن دھوم دھڑکے سے منا رہی ہوں گی۔ ان کی زندگی کا مقصد ہی لوگوں کو اڑنگا دے کر نیچے گرانا تھا۔ وہ جیسے مرضی تالیاں بجائیں۔ اقصیٰ کی حفاظت اسی میں تھی کہ وہ جویریہ کے کمرے میں بند ہو جائے' شاید وہ چھٹیوں کے خاتمے تک بند ہی رہتی کہ ایک دن اس کا قفل ٹوٹ ہی گیا۔ طلحہ کا میل نرس اس کے لیے پیغام لایا تھا۔

"سر پوچھتے ہیں' آپ کے پاس یہ والی کتاب ہے۔"

اس نے سوئی دانتوں میں روک کر پرچی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ ڈاکٹر نے اسے لیٹ کر پڑھنے سے منع کیا تھا۔ وہ اس کو کتابیں پڑھ کر تو نہیں سنا سکتی تھی لیکن اس کی اتنی خدمت تو وہ یہاں بیٹھے ہی کر سکتی تھی پرچی پر انگریزی میں لکھا تھا۔ "بزدل۔"

اس کے چہرے پر دوسرا رنگ آگیا۔ اس نے فیصلے کرتے ہوئے طلحہ کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ اسے بھی کوئی رائے رکھنے کا حق تھا۔

ماہ رخ نے ایک نظر پرچی پر ڈالی۔ اسے کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"کبیر چچا کی الماری سے کتابیں پڑھتے تھے طلحہ بھائی' وہاں پر دیکھنا۔" میزبانی کے طور پر اس نے اقصیٰ کی مدد کرنا اپنا فرض جانا۔

"ایسا کرو۔" اس نے میل نرس سے کہا۔ "کبیر چچا اس وقت کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ان کی الماری کھولنا اچھا نہیں لگتا' شام کو بھجوا دوں گی۔"

میل نرس چلا گیا اور مہ رخ نے بھی مداخلت کرنے کا موڈ اختیار نہیں کیا ورنہ اس کو کتاب کی تلاش سے زیادہ تشکیل میں دقت ہوتی۔ اقصیٰ کچھ دیر بیٹھی سوچتی رہی اور لمبی سوچ کے نتیجے میں وہ شام کو جھینپی جھینپی سی طلحہ کے کمرے میں چائے بنا رہی تھی۔ وہ خوب خوش ہو رہا تھا۔

"میں سوچ رہا تھا آپ کے نام کوئی شعر بھیجوں وہ بھی فلمی۔ مثلاً "محبت میں تیرے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر مشکل یہ تھی آپ تو مذاق سمجھ لیتیں' کسی اور کے ہاتھ لگ جاتا تو زبردستی کی محبت کروا کے ہی دم لیتا۔"

اس کی پشت طلحہ کی طرف تھی۔ یہ بھی غنیمت ہوا۔ وہ اس سے اس قدر کھلے مذاق کی توقع نہیں کر رہی تھی لیکن وہ فتح کی خوشی میں اپنے اوپر سے ضبط کے اختیارات کھوتا ہوا معلوم دے رہا تھا۔ اقصیٰ اس کی سوچ کی معصومیت سے بہت متاثر ہوئی لیکن یہ تاثر زیادہ دیر پا ثابت نہیں ہوا۔ ان دنوں باورچی خانے میں مہ رخ کی ڈیوٹی تھی۔ اقصیٰ رات تو جویریہ کے کمرے میں گزارتی' لیکن دن بھر مہ رخ کے آگے پیچھے پھرتی۔ مہ رخ باتیں مزے کی کرتی تھی۔ اقصیٰ باورچی خانے میں اس کی جوائنٹ بن گئی۔ حالانکہ مہمان داری میں اس کا باورچی خانے جانا منع تھا۔ مہ رخ سبز بھنڈیوں کا ڈھیر پھیلائے باریک باریک کتر رہی تھی۔ آج بھنڈیوں کی بھجیا پکانی تھی۔ رمضانو پیاز چھیلنے کے لیے باہر لے گئی۔ سرخ ٹماٹر خود پودوں سے اقصیٰ چھانٹ کر لائی۔ وہ جب باورچی خانے کی طرف والی کیاریوں سے ٹماٹروں کی ڈھیری توڑ کر اندر لا رہی تھی تو اسے جویریہ نظر آئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور گال ٹماٹر کی طرح لال لال۔ وہ کالج سے واپس آئی تھی اور پلک جھپکتے اندر گھس گئی۔ کالج میں تو چھٹیاں تھیں' لیکن ان کی ایک ٹیچر فالتو پیریڈ لیا کرتی

تھی۔ ایسی پڑھائی کا کیا فائدہ جب انسان کا دل ہی اس کے قابو میں نہ ہو۔

"ایک بات بتاؤ مہ رخ! یہ جویریہ اتنی پراسرار کیوں ہے؟"

"کیوں بھئی۔" اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔

"ہر وقت روئی روئی سی لگتی ہے۔ کوئی بات کرو تو ڈانٹ دیتی ہے۔"

"ارے تمہیں نہیں پتا؟" مہ رخ حیران رہ گئی۔

"کو یہ تو بچے بچے کو پتا ہے۔ طلحہ بھائی نے جویریہ سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔"

"کر دیا ہے؟" وہ حیران رہ گئی۔

"کو کب کا' طلحہ بھائی کو کسی لڑکی سے عشق تھا۔ اس کا پتا نہیں کیا نام تھا نور الصباح' یا مصباح کچھ ایسا سا ہی تھا۔ وہ کہنے لگے میں اس سے شادی کروں گا' جویریہ سے نہیں کر سکتا پھر جویریہ بڑا روئی دھوئی۔ سب نے کہا بھی کہ منگنی کے وقت تو تم چپ رہے۔ کوئی پرانی بات تو نہیں ابھی پچھلے سال ہی تو منگنی ہوئی تھی۔"

اقصیٰ اس انکشاف پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ چھری اور ٹماٹر ہاتھ میں پکڑے۔ بس اس کی انگلیاں مضبوط تھیں' یونہی نہیں کٹ جاتی تھیں۔

"اسی وجہ سے تو غصہ ہے سب کو' طلحہ بھائی پر اور طلحہ بھائی کچھ کہتے بھی نہیں۔ بڑی آپا نے تو کہا بھی۔ ٹھیک ہے تمہیں جس لڑکی سے شادی کرنی ہے' اسی سے کر لو پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ میرا خیال ہے طلحہ بھائی کی پسند کو زوال آتا رہتا ہے۔ آج ایک دوست بنی ہے' کل محبوب' پرسوں چھٹی۔"

اس کی کنپٹیاں دھڑکنے لگیں۔ لوگوں کا نام لے کر کہیں مہ رخ اسے تو متنبہ نہیں کر رہی۔ وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھی کہ وضاحت کرتی۔ لیکن آج سے پہلے طلحہ اسے اتنا برا تو کبھی نہیں لگا تھا۔ وہ جذبوں کی قدر کرتی تھی لیکن جذبوں کی منہ زوری کی قائل نہیں تھی۔ مصباح' مصباح سے تو وہ اچھی طرح آگاہ تھی لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ان دونوں کے درمیان رابطے کی یہ کڑی ہے۔ وہ مایوس ہو گئی۔ وہ کون شخص ہو گا جو جویریہ جیسی لڑکی کو ٹھکرا کر کسی اور لڑکی کے لیے پاگل ہو سکے۔ مہ رخ کہہ رہی تھی۔

"دراصل لڑکیوں کے لیے طلحہ بھائی میں بڑا گلیمر ہے۔ اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔ ایتھلیٹ ہیں۔ گھوڑا دوڑاتے ہیں' کاریں بھگاتے ہیں' باتیں ایسی کرتے ہیں کہ جب تک کرتے رہتے ہیں' آدمی مسحور ہو کر بیٹھا رہ جاتا ہے اوپر سے خدا نے شکل ایسی بنا دی ہے اور۔"

"زخمی ہو کر نیا فائدہ ہوا۔ حسین لڑکیوں سے ہمدردی کے نام پر تیمارداری مل گئی۔" فیروزہ ہنستی ہوئی داخل ہوئی' ایک دروازے سے گھسی اور کیاریوں کی طرف والے دروازے سے باہر نکل گئی۔ دراصل اس نے اپنے پیچھے بڑی آپا کی چپلوں کی کھس کھس سن لی تھی۔

"یہ وقت ہونے کو آیا بچے کو روٹی نہیں گئی۔" بڑی آپا کا سفید بالوں والا سر دروازے میں نمودار ہوا۔

مہ رخ نے جلدی سے اپنا منہ ہانڈی کے گلے میں تقریباً" ڈال ہی دیا۔ اگر بھنڈی میں لیس رہ گیا تو بڑی آپا ناراض ہوں گی۔ اسے خود کو مصروف بھی تو ظاہر کرنا تھا۔

"ابھی تو سبزی بھی نہیں گلی۔ شاباش ہے اور یہ اقصیٰ جو تھوڑا بہت دھیان کرتی تھی' وہ بھی سوئی دھاگے کی ہو کے رہ گئی۔ ذرا کوئی اس کے کمرے میں بھی چکر مار لیا کرے' میری نماز نکلی جا رہی ہے۔" وہ تخت پر واپس چلی گئیں۔

"توبہ۔" مہ رخ ہولے سے بڑبڑائی۔ "بڑی آپا سو کام ایک ساتھ بتا دیتی ہیں۔ اسے بھی پوچھو۔ کھانا بھی بناؤ۔ فیروزہ! فیروزہ۔" اس کے کان پٹم ہو گئے۔

"ہونہہ فیروزہ بیگم تو پڑھ رہی ہوں گی' کسی دور دیس کے شہزادے کی داستان جو غریب لڑکی پر عاشق ہو کر ایک دن ان سے بھی عشق کرے۔" مہ رخ کتابوں کی

دشمن تھی۔

"آرام طلب پوستی۔" مہ رخ گھی میں بھنڈیاں گھماتے ہوئے بولی۔ "ذرا دیکھو تو اقصیٰ پلیز۔ انہیں کیا چاہیے۔" اس کے انداز میں بڑی خفگی اور بیگانگی تھی۔ وہ پوستی' آرام طلب نہیں کہلوانا چاہتی تھی۔

اس نے جالی کے پردے سرکا کر کمرے میں جھانکا۔ وہ حسب عادت پڑھ رہا تھا۔ کتاب سینے پر اوندھا کر مسکرا دیا۔ "آپ کو فرصت مل گئی۔"

"مجھ کو کیا حق پہنچتا ہے بھلا کسی سے خفا ہونے کا۔" اس نے خفگی کے اظہار کو درگزر ہی کیا۔ ہر انسان کے اپنے اصول ہوتے ہیں اور اسی کا کیا خاص رشتہ ہے' ایسے ایسے کئی چچا زاد ماموں زاد اس گھر میں پھرتے ہیں۔ ہمدردی کی قیمت میں آخر انسان کیا کچھ لٹا سکتا ہے؟

"آپ کچھ مانگ رہے تھے؟"

"خدا سے؟ میں تو آج کل ہر وقت مانگتا رہتا ہوں۔"

"کتاب پڑھ کر سناؤں۔"

"کیا بات ہے۔" وہ فکر مند ہو گیا۔ "اتنی لگاوٹ کا اظہار آپ تو نہیں کیا کرتیں' کسی نے سکھا کر بھیجا ہے۔"

وہ انگلیاں مسلنے لگی۔ اس کی چوری ہمیشہ پکڑی جاتی تھی۔ وہ نفرت اور محبت کے اظہار میں کوئی پردہ رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ لوگ دلوں میں کتنی کدورتیں پال کر ہنس ہنس کر ملتے ہیں۔ اس کے لیے یہ بڑا مشکل تھا کسی ایسے شخص سے وہ ہنس کر بات کر سکے جو جویریہ کے دن رات کے آنسوؤں کو نظر انداز کر کے مصباح کے جوتے دل میں سنبھال سنبھال کر رکھے۔

وہ حسب عادت ماتھا رگڑنے لگا۔ یہ اس کے سوچنے کی عادت تھی۔ جب بھی وہ پریشان ہوتا۔

یہ بدلہ لینے کا وقت تو نہیں۔ وہ جانتی تھی۔ وہ جب تک عام آدمی کی طرح چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو جائے۔ کسی کو اس سے باز پرس کا حق نہیں۔ شیر کا مارا ہوا گیدڑ کھاتے ہیں' اسے کیا پڑی اختری چچی کی طرح کمزور ٹارگٹ دیکھ کر بھوکوں کی طرح پڑ جاؤ۔ میل نرس نے اسے سلام کیا۔ وہ جانے کیا سمجھتا تھا لیکن اسے بڑی باقاعدگی سے سلام کرتا تھا۔ وہ میلا کپڑا اٹھا کر چیزوں کی صفائی پر تل گئی۔ کتنے دنوں سے اس کا کمرہ ان چھوا پڑا تھا۔ وہ جویریہ سے بہتر نہیں چمکا سکتی لیکن اسے جویریہ کی خوبیوں سے بھی کیا دلچسپی ہے۔ وہ اپنی سزا پا رہا تھا۔ مونگ کی پتلی دال کے سوپ کا پیالہ اس کے سرہانے ادھ کھایا پڑا تھا۔ وہ شاید صبح سے یونہی پڑا ہو گا' اس پر پپڑی کی تہہ جم گئی تھی۔ وہ جب سے اقصیٰ کی ماتحتی سے نکلا تھا بڑی آپا نے اس پر پھر قبضہ جما لیا تھا۔ وہ گھی کا شوربہ پینے کے سلسلے میں اپنے وعدے کا بڑا پابند نکلا۔

وہ میل نرس سے زیادہ مستعد ہو گئی تھی۔ وقت پر کھانا دینا۔ کمروں کی صفائی۔ وہ کسی چیز میں کمی نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ سوائے خلوص کے۔ خلوص کے سلسلے میں وہ بڑی محتاط ہو گئی تھی۔ اس کا پلاسٹر اترا۔ ہڈیوں کے ایکسرے ہوئے اور ان دنوں اس نے جو تکلیف اٹھائی کہ اس کے دشمن بھی اس کے خیر خواہ ہو گئے۔ اس نے جویریہ کو بھی چھپ چھپ کر روتے اور دعائیں کرتے دیکھا تھا۔ اسے جویریہ کا کبھی چھپ چھپ کر رونا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسے طلحہ کی تکلیف بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ دوبارہ اسپتال میں داخل ہوا تو پھر زود رنج سا ہو گیا تھا۔ اسپتال سے اس کی وابستہ تلخ یادیں اسے غصیلا بنا رہی تھیں۔

مہ رخ کہتی تھی "اس میں جتنے بھی عیب ہوں وہ احسان فراموش نہیں۔ وہ اقصیٰ کا اتنا ممنون ہے آج بھی ساری تکلیفیں بھلا کر اس سے مسکرا کر ملتا ہے۔"

طغرل اس دن اقصیٰ کو طلحہ کے پاس بٹھا کر اسٹور سے دوائیں لینے چلے گئے۔ وہ جاتے ہوئے بتا بھی گئے تھے کہ مشکل سے ملتی ہیں دور جانا پڑے گا۔ اگر اقصیٰ گھبرا جائے تو ڈیوٹی روم سے فون کر کے کسی کو بھی بلا سکتی ہے۔ طلحہ مسکرانے لگا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں طغرل! انہیں گھبرانے نہیں دوں گا۔"

وہ پندرہ بیس منٹ کے لیے آئی تھی۔ بڑی آپا نے اسے کھڑے کھڑے خیریت معلوم کرنے بھیجا تھا۔ ادریس بھائی ان دنوں ٹور پر تھے۔ طغرل یوں بھی سارا دن اسپتال ہی میں ہوتے' چچاؤں میں سے کوئی بڑی آپا کے ہاتھ نہیں لگتا تھا۔ بڑی آپا ہر پندرہ منٹ بعد کسی کو اسپتال دوڑاتیں۔ وہ بڑی آپا کو وہمی سمجھنے لگے تھے' بڑی آپا ہو بھی وہمی گئی تھیں۔ انہیں پتا تھا اقصیٰ ان کی بات نہیں ٹالے گی۔ لہٰذا انہوں نے اس کے کان میں سکھا پڑھا کر بھیجا تھا۔ "رکشہ لے جائیو اور اڑتی جائیو اور اڑتی آئیو۔" یہاں آکر وہ پابند ہو گئی۔ طغرل نے اس کی سنی بھی نہیں۔

جتنی دیر اقصیٰ بیٹھی رہی' وہ تکلیف ضبط کرتا رہا۔ نہ کراہا نہ شور کیا ضبط اور برداشت سے مسکراتا' اقصیٰ اپنی تمام خطائیں معاف کرواتا نظر آرہا تھا۔ یہ کسی کی شخصیت کے دو انتہائی مختلف پہلو تھے۔ اس قدر بہادر آدمی ایسا بدکردار کیسے بن سکتا ہے۔ وہ بار بار ڈرپ کے قطروں کی گنتی کرنے لگتی اور وہ بار بار مسکرا کر ٹوک رہا تھا۔

"اوں۔ گھبرانے کی نہیں ہے بھئی۔ میں وعدوں کی حفاظت کرنے والا آدمی ہوں۔"

"تم کرسی پر ٹھیک سے تو بیٹھی ہو نا۔ یہ کشن لگا لو۔"

"لائٹ تنگ تو نہیں کر رہی۔" وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پوچھتا رہا جیسے بیمار اقصیٰ ہو اور وہ تیماردار۔

"لگتا ہے تم بور ہو رہی ہو۔ اچھا یہاں آکر بیٹھو باتیں کرتے ہیں۔"

"باتیں کرنے سے تو ڈاکٹر منع کرتے ہیں۔" وہ سامنے تو آگئی۔

"سننے سے تو نہیں کرتے نا۔ تم کرو' میں سنتا ہوں۔"

وہ چپ رہی۔

"پہلے تم بتاؤ۔ کچھ۔ پھر میں بھی بتاؤں گا۔"

"آپ ہی بتا دیجیے۔"

وہ ہنس دیا۔ "جب تک تم پوچھو گی نہیں۔ میں بھی نہیں۔ مجھے تمہارے رویے کی تبدیلی کے بارے میں سب کچھ پتا ہے۔ وجہ بھی پتا ہے لیکن میں منتظر تھا' تم الزام لگاؤ تو میں وضاحت کروں۔ تم نے وضاحت کا موقع ہی نہیں دیا۔ تمہارے نزدیک جھوٹے لوگ تو معتبر ٹھہرے اور میں جھوٹا پڑ گیا۔ خیر۔"

وہ تکیہ سے ٹیک لگا کر نڈھال سا ہو گیا۔ وہ اب کیا کہتی "جویریہ کے آنسو جھوٹے ہیں؟ مصباح کے لیے تمہاری بے قراری جھوٹی ہے؟" طغرل کہنے کے مطابق دیر سے آئے اور آتے ہی اقصیٰ کو گھر چھوڑنے چلے گئے۔ انہیں رات یہاں پر ہی گزارنی تھی۔ راستے میں وہ ڈاکٹروں سے بات کرنے کے لیے رکے۔ اس اثناء میں اقصیٰ نے اپنے چہرے کے سارے رنگ مسکراہٹ میں دھو دیے۔ سسٹر بلا جانے سے پہلے اسے خدا حافظ کہہ رہی تھیں۔

طلحہ جب دوبارہ گھر آیا تو پہلے سے بہت بہتر تھا۔ جسمانی طور پر بھی اور مزاجاً" بھی۔ لوگوں نے اس کے موڈ کی یہ تبدیلی خاص طور پر نوٹ کی۔ آج کل اسے صرف اپنی ٹانگ ہی سے دلچسپی لگ رہی تھی۔ سارا دن گھٹنا کھڑا کرنے اور لٹانے کی وہ پریکٹس کرتا' اب نہ برتن واپس آتے تھے۔ نہ لوگوں کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا جاتا۔ حتیٰ کہ بیماری کے دنوں میں جو دن رات کتابوں کا ورد کیا کرتا تھا اب وہ بھی بند تھا۔ اقصیٰ کی گرمی کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ فائنل کا زمانہ اور غیر ذمے داری کا یہ حال کہ تین کے تین مہینے طلحہ صاحب کے نخروں کی نذر ہو گئے۔ اس کا ریکارڈ پچھلے سے کوئی غیر معمولی شاندار نہیں رہا تھا' لیکن وہ فیل ہو کر اپنا تماشا بھی نہیں لگوانا چاہتی تھی۔ اس نے جانے سے پہلے اجازت کے لیے بڑی آپا سے تذکرہ کیا۔ اختری چچی دھوبی کی کاپی پر حساب لکھوا رہی تھیں۔ "تو چادریں' تو تکیہ غلاف' چار تولیے۔" وہ بے سبب ہنس پڑیں۔ دوپٹہ منہ میں ٹھونس کر دیر تک ہنستی رہیں۔ بہت زیادہ ہنسنے سے ان کا وزنی پیٹ پھد پھد کرنے لگتا۔

بڑی آپا اس کے جانے کے دن نزدیک آتے تو رو

پڑتی تھیں۔ کہاں لاہور کہاں ایبٹ آباد۔ پھر اگلے سال تک کون اسے آنے دے گا۔ زندگی کا کیا بھروسا۔ بڑی آپا اختری چچی کی بے وقت ہنسی پر جھلا گئیں۔

"اے اختری! تو کبھی سمجھداری کی بات بھی کرے گی یا یونہی بچوں میں ملی چبکوں کی طرح ٹھی ٹھی ٹھا ٹھا۔" اختری چچی فوراً سنجیدہ ہو گئیں۔

"لو بڑی آپا! تم بلا سبب روٹھ گئیں۔ میں تو تمہارے لیے ایسا نسخہ لائی تھی تیر بہ ہدف۔ اقصی کو کہیں جانے کی ضرورت بھی نہ پڑتی تم بھی بھووالی ہو جاتیں۔ لیکن سچی بات ہمارا کہا تو صرف شک شبہ کے لیے۔"

وہ ململ کے دوپٹے کے کونے سے بڑی آپا کی طرف سے گھونگھٹ سا کر کے بیٹھ گئیں۔ "ہاں منی۔ گنیو کل کتنے ہوئے۔" فیروزہ نے ایک دفعہ گنتی کی۔ پھر دوسری دفعہ۔ بڑی آپا چپ کی چپ رہ گئیں۔ یہ تو انہوں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا یا پایہ تکمیل تک پہنچانے کے عذاب سے ڈر گئیں۔ یہ نئی بات تو کچھ بھی نہیں۔ جو جوریہ کے ساتھ ہوا وہ یہاں بھی ہو گا۔ بھو کے میکے میں تو وہ ویسے ہی نکو ہیں اب تو گردن زدنی بھی ہو جائیں گی۔ انہوں نے عینک کے کیس سے عینک نکالی، آنکھوں پر چڑھائی اور "معن معین" پر جھک گئیں۔ اقصی کو پیچھے سے ان کی صرف کمر کا خم نظر آرہا تھا۔ لرزتا ہوا، جھکا ہوا۔ اقصی کو تاؤ آگیا۔ وہ سمجھ تو گئی تھی اختری چچی نے بڑی آپا کو کس کا نام لے کر لرزا دیا ہے۔ لیکن اختری چچی بڑی شاطر تھیں۔ مہرے سنبھال سنبھال کر چلتیں۔ لگ گیا تو تیر نہیں تو تکا ایسے سنبھال سنبھال کر الفاظ استعمال کرتیں۔ جب دل چاہتا مفہوم کو ضرورت کے تحت بدل ڈالتیں۔ ایسے سیاست دان کے منہ لگنا بڑا تیکھا کام تھا۔

اقصی غصے میں جا کر سامان سمیٹنے لگی۔ اس کے گرد سوالات کی ایک چھتری تنی ہوئی تھی۔ ردا، فیروزہ، مہ رخ، جوریہ "کیوں جا رہی ہو ابھی تو آٹھ نو دن باقی ہیں۔ کچھ اور رہ لیتیں چھٹی منگا لیتیں؟"

اس کے پیکنگ کے انداز میں جو جارحانہ پن تھا، وہ کسی سے چھپا نہیں رہ سکا۔ وہ بھاگتی ہوئی غسل خانے میں جاتی، برش شیمپو پیسٹ وغیرہ اٹھا کر آجاتی۔ پھر تھوڑی دیر سوچتی۔ دوڑتی جاتی باہر صحن میں تنے ہوئے تار سے تولیہ اتار کر لے آتی۔ پھر کچھ دیر بڑبڑ کرنے کے بعد چارپائی کے نیچے سے جوتیاں گھسیٹتی۔ بڑی آپا بار بار کہتیں۔

"دیکھیو۔ کچھ رہ نہ جائے۔" کیونکہ کچھ رہ جانے پر وہ سال بھر دل مسوستی رہتی تھیں۔

جوریہ... کام کے سلسلے میں اس کی اس قدر گرم جوشی کو نہایت خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے کمرہ خالی ہو گیا تھا۔ بڑی آپا زادِ راہ کے حلوے پکانے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ چنے کی دال کا حلوہ۔ سوجی کی ٹکڑیاں۔ مہ رخ پکانے ریندھنے میں ماہر تھی۔ بڑی آپا اسے بھی گھسیٹ لے گئیں۔ دھوبی کے حساب کتاب کے دوران اختری چچی کا جو موڈ آف ہوا وہ برقرار تھا۔ انہوں نے فیروزہ کو اوپر بلوا لیا۔ ردا کے یوں بھی میٹرک کے امتحان تھے۔ نلے گلے میں تو وہ آجاتی لیکن سنجیدہ موضوع دیکھ کر بدک جاتی۔ جوریہ اقصی کا ہاتھ بٹانے لگی۔ مسلی و سلی قمیص کی ماہرانہ سی تہہ بٹھاتے ایک مرتبہ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

"تم کس سے روٹھ کر جا رہی ہو اقصی۔"

"کسی سے نہیں۔" اس نے روٹھے لہجے میں کہا۔

"پلیز۔ اتنے دن تو ٹھہر جاتیں، طلحہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے۔ تو۔ تو۔"

اقصی نے چونک کر سر اٹھایا۔ "اچھا۔ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں۔ تمہیں کیا فائدہ دیں گے۔ اگر تم اس کی ضمانت دو کہ وہ چلتے پھرتے باہر نہیں نکل جائیں تو۔ لعنت ہے تم پر جوریہ! اور تمہارے "پتی ورتا ازم" پر۔"

جوریہ نے بے چینی سے ہونٹ چبا لیے جیسے وہ انہیں کھلنے کو، بولنے کو منع کرتی ہو۔

"تمہیں اب کیسے سمجھاؤں۔ تم نہیں جانتیں۔ میں جانتی ہوں طلحہ تم سے محبت کرنے لگے ہیں۔

کسی عورت کے لیے اس سے بڑا مرتبہ کیا ہو گا کہ اسے پسند کیا جائے۔ پھر اسے پروپوز کیا جائے۔" کسی اندرونی محرومی سے اس کی آنکھیں چھلک گئیں "تم گنی چنی خوش قسمت لڑکیوں میں سے ہو' اس موقع کو ضائع نہ کرو۔"

"ارے واہ۔" وہ جھلا گئی۔ "موقع کو ضائع نہ کرو۔ شادی نہ ہوئی کلیرنس سیل ہو گئی۔ تمہیں یہ غلط فہمی پہلے دن سے ہے' لیکن سن لو مجھے ان کے کمرے میں جانے سے دلچسپی کسی عشق محبت کی وجہ سے نہیں تھی۔ یونہی اکیلا آدمی دیکھ کر میرا دل سلگتا ہے' تم بہت سے لوگوں میں رہتی ہو' اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ میں چار سال کی یہاں سے گئی تھی اور آج سترہ سال سے بالکل ہی اکیلی ہوں۔ اکیلے آدمی کا دکھ مجھ سے بہتر کوئی نہیں سمجھتا اور تم کیا سمجھ رہی ہو کہ میں چھپ کر بھاگ رہی ہوں۔ نہیں میں تمہارے طلحہ صاحب سے مل کر اور دو دو ہاتھ کر کے ہی جاؤں گی۔"

وہ بکتی جھکتی چلی تو گئی تھی لیکن اس کے دروازے سے آگے بکھرے چوراہے پر بار بار راستہ بھٹکنے لگی۔ وہ اس سے کیا کہنا چاہتی ہے اور جواب میں کیا سننے آئی ہے؟

وہ کرسی پر بیٹھا تھا اور اپنی ٹانگ ہلا رہا تھا' اسے دیکھ کر رک گیا۔

"میں جا رہی ہوں۔"

"سنا میں نے۔ ظاہر ہے تمہیں جانا ہی تھا لیکن غلط فہمیوں کے بنڈل تو یہیں چھوڑ جاؤ۔"

"مجھے کوئی غلط فہمی نہیں۔ اور میں کسی قسم کی وضاحت بھی سننے نہیں آئی۔"

اس نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر ایک کشن اس کی طرف اچھالا۔

"اچھا بیٹھ تو جاؤ۔ کم از کم یہ تو سوچو۔ میں تمہیں اٹھ کر روک نہیں سکتا' پکڑ کر بٹھا نہیں سکتا۔ اگر میں بیمار نہ ہوتا تو دیکھتا تم کیسے میری بات سنے بغیر جا سکتی تھیں۔"

وہ وہیں دھڑام سے کشن پر بیٹھ گئی۔ حالانکہ وہ پکے ارادے سے آئی تھی ایک لمحہ نہیں بیٹھے گی۔ طلحہ ہنسنے لگا۔

"دیکھ لو۔ اس کو استحصال کہتے ہیں۔ بخدا اگر بیمار نہ ہوتا تو ان جارحانہ تیوروں کی موجودگی میں تمہیں کبھی نہیں روک سکتا تھا۔"

وہ ہاتھ مروڑنے لگی۔ کیا کہنا چاہتا ہے اب کہہ بھی چکے۔ اختری چچی قسم کے لوگ تو اپنی ذات سے اعتماد بھی اٹھوا دیتے ہیں۔

"مصباح نامی خاتون کے سلسلے میں تمہیں کیا کہوں۔ مجھے ان سے کبھی بھی محبت نہیں تھی۔ انہیں بھی نہیں تھی لیکن وقت میری گرفت میں نہیں تھا۔ میں ان سے زبردستی کی محبت میں گرفتار ہوا کیونکہ ان دنوں حالات کچھ ایسے ہی تھے۔ ایکسیڈنٹ کے وقت اتفاقاً" وہ میری گاڑی میں موجود تھیں۔ یہ کوئی کورٹ شپ نہیں تھی۔ جب میرے ساتھ ان کا کوئی اتا پتا نہ لگا تو میں سمجھا وہ فوت ہو گئیں۔ لوگ اس قدر پراسرار بھی تھے۔ میرا خیال ہے ان کے خراش بھی نہیں آئی۔ لوگوں نے جب انہیں گاڑی سے نکالا اور میں یہ سوچ سوچ کر غمزدہ ہوتا رہا کہ وہ بے چاری میری وجہ سے فوت ہو گئی۔"

اس نے اپنا پاؤں پھیلا دیا اور انگلیاں شمالاً" جنوباً" ہلانے لگا۔ یہ ہی اس کی ایکسرسائز تھی۔

"طغرل نے وہ خون آلود دوپٹہ اور جوتی مجھے لا کر دی۔ جسے دیکھ کر آپ مجھ سے بالکل ہی فرنٹ ہو گئیں۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ وہ خون بھی میرا ہے۔"

"لیکن آخر وہ آپ کی کار میں بیٹھی کیوں تھی۔" اس کے منہ سے اسی تحکم بھرے غصے سے نکلا لیکن پھر وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"یہ آپ مجھے کیوں سنا رہے ہیں۔ جسے سنانا چاہیے اس کو ہی سنائیں۔"

وہ دیر تک کھل کر ہنستا رہا۔ "پہلی بات۔ وہ اکیلی لڑکی میری کار میں نہیں تھی کوئی اور بھی ہو سکتی ہے۔

جس طرح کوئی آدمی بیٹھ سکتا ہے اسی طرح کسی خاتون کو بھی یہ اختیار ہے۔ ہاں مصباح دوبارہ نہیں بیٹھ سکتی' بزدلوں کے بارے میں میری اچھی رائے نہیں۔ رہ گئی دوسری بات تو جسے سنانا چاہیے اسے ہی سنا رہا ہوں۔"

وہ اٹھنے لگی تو اس کی نگاہ اس کے ساتھ ساتھ اوپر اٹھی "ماہر نفسیات کہتے ہیں میں "ایکسیڈنٹ۔ پر اِن پرسنیلٹی "ہوں۔ ایک دن تمہیں بھی اپنی کار میں بٹھا کر تمہارا ایکسیڈنٹ بھی کروں گا۔ میرا وعدہ' بچپن سے اب تک میرے سولہ حادثے ہوئے ہیں۔ چار بڑے۔ بارہ چھوٹے۔ سترھواں حملہ سومنات کا ہوگا۔ تم سومنات بننا۔ میں محمود بنوں گا۔"

"اچھا تو غزنوی صاحب! خدا کرے آپ کا ایاز بھی مل جائے۔ تب تک کے لیے خدا حافظ۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

بڑی آپا اس کا سامان چیک کرنے کمرے میں آئی ہوئی تھیں۔ اپنی مدد کے بغیر انہیں دنیا کا ہر کام ادھورا لگتا تھا۔ بکسہ کھلا ہوا تھا اور سارا سامان دوبارہ چارپائی پر ڈھیر تھا' ردا بڑی آپا کی مدد سے صندوق جما رہی تھی۔ بڑی آپا کو اس کی لائی ہوئی ساری چیزیں زبانی یاد تھیں۔ سو بار بڑی آپا اللہ حافظ کہتیں اور ہر بار وہیں کی وہیں بیٹھی رہتیں۔ ہر مرتبہ ہی اس کا دل چاہتا تھا بڑی آپا کو اپنے ساتھ لے جائے لیکن کبھی اس خواہش کے اظہار کی جرات نہیں ہوئی۔

"بڑی آپا! میں پھر آؤں گی۔" اس نے اس دفعہ بھی یہی فقرہ کہا۔

اس کے جانے کے ہنگامے سے جو چیزیں تتر بتر ہو گئی تھیں۔ چچی جان انہیں سمیٹ رہی تھیں۔ معنی خیز انداز میں مسکرا دیں۔

"ہاں کیوں نہیں۔" بڑی آپا نے کچھ خیال نہیں کیا۔ "تیرا گھر ہے سو بار آ سو بار جا۔ خدا زندگی دے' صحت دے لیکن تیری یہ عادت بہت بری ہے۔ لوگوں کی کہی دل سے لگا لیتی ہے۔ کسی کے کہے کی پروا نہ کیا کر۔ جس سے دل مطمئن ہوا کہا نہ ہوا نہ کہا۔ اب کے تو میں نے اختری چچی کو بھی سنا دیں۔"

"اختری چچی۔" وہ سہم گئی۔ "انہوں نے کیا کہا تھا؟"

"کہتی کیا۔ بس اس کی فطرت سے جولاہا پن نکلا نہیں اوندھی سیدھی بک رہی تھی۔ میں نے جھاڑ دیا۔ اب میں اس طرح شکوے گلے سننے بیٹھ جاؤں تو بس ہولی مجھ سے گھرداری۔" انہوں نے الٹا ہاتھ ماتھے پر رکھا جیسے سلام کرتی ہوں۔ "جس کا دل چاہے خوشی سے رہے۔ نہ جی چاہے تم اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر۔ فی امان اللہ۔"

وہ حیران رہ گئی۔ بڑی آپا کے ارادے کتنے مصمم تھے۔ وہ ذرا بھی تو ڈانواں ڈول نہ ہوتیں۔ ان کا گھر جیسے تحریری آئین تھا۔ ایک لفظ کے ردوبدل ہونے کا امکان نہیں۔

اس کی واپسی کا ڈرامہ ہر سال کی طرح آنسوؤں سے لکھا گیا تھا۔ بڑی آپا' پھپھو چچیاں چچا بچے حتی کہ اختری چچی بھی۔ "ہائے بچی کے جانے سے گھر سونا سونا ہو جاتا ہے' کتنے دن تو کسی کا دل ہی نہیں لگے گا۔" وہ پتا نہیں "کسی" میں کس کس کو شامل کر رہی تھیں۔ جو یہ اسی بردباری سے ناک پونچھنے کے بہانے ہنسی چھپانے لگی۔

اسٹیشن چھوڑنے اسے سب ہی جاتے تھے' کیونکہ جانے والے دن اقصیٰ بھی رونا دھونا مچا دیتی تھی۔ آتے ہوئے جتنی خوشی ہوتی سب جانے والے دن کے خوف میں مٹی مٹی ہو جاتی۔ حتی کہ وہ جانے والا دن ایک دن آ کر جدائی ڈال ہی جاتا ہے۔

"مہ رخ! میرا گھر آخر کہاں ہے؟ میں یہاں ہوں یا وہاں۔ میرا دل دوسری طرف لگا رہتا ہے۔ یہاں سارا وقت میں امی کے لیے پریشان رہتی ہوں کہ وہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائیں اور وہاں جا کر کتنے ہی دن مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ بس تم لوگ یاد آتے رہتے ہو۔"

"اس کا بڑا اچھا علاج ہے اقصیٰ آپا! آپ شادی کر لیں اور دونوں میں سے کسی ایک گھر کو مستقل ٹھکانہ بنا لیں۔"

روا جب بہت زیادہ سنجیدہ بات کہنے کی کوشش کرتی تو جھلملاتی ہوئی معصوم آنکھیں اس کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔
انضی سٹپٹا گئی۔ یہ کچھ اسی کا قصور تھا جو بچے بچے نے کمائی کرلی۔ جویریہ اس کے بارے میں جو نہ سوچے وہ کم۔

♥ ♡ ♡ ♡ ♥

وہ لاہور اتری تو ایسی حالت میں تھی کہ سارے سفر میں روتی رہی' اس پر لاہور والوں کا رویہ مزید دل جلا دینے والا تھا۔ امی صحن کے نل کے پاس چبوترے پر کپڑوں کا گٹھڑ لے کر بیٹھی تھیں۔ سارے گھر کے تولیے' چادریں' قمیصیں شلواریں جیسے پچھلے تین ماہ سے انہوں نے دھلائی کی نہیں تھی۔ سلام کا اکھڑا سا جواب دے کر وہ دستی سے کوٹتی رہیں۔ اس کا جھکا ہوا سر جیسے انہوں نے دیکھا ہی نہیں تھا پھر ہاتھ کیا پھیرتیں۔ وہ جب بھی بڑی آپا کے گھر سے آتی امی ایسا ہی مظاہرہ کیا کرتی تھیں۔ خشک خشک اکھڑا اکھڑا۔ لیکن پھر وہ جلد ہی بے تاب بھی تو ہو جاتیں۔
"اے۔ بڑی آپا کیسی ہیں۔ اب بھی ان کی بہوؤں سے لڑائی ہوتی ہے؟ اختری کے بچے کتنے بڑے بڑے ہو گئے؟ بے چاری اختری بڑی آپا کا بس چلتا تو اس کو طلاق دلا کر ہی دم لیتیں۔ وہ تو سمجھو کہ سفیر ہی بیوی کے غلام نکلے۔ ہمارے والوں کی طرح تھوڑی۔ ساری عمر بڑی آپا کی جوتیاں بھی سیدھی کیں طعنے بھی سنے۔"
"شمسہ بے چاری جوانی میں بیوہ ہوئی تھی اسے تو آپا نے دال ساگ صاف کرنے کے لیے رکھ چھوڑا۔"
امی کا کہا ہر لفظ درست ہوتا لیکن اپروچ غلط تھی اور اب۔ اب تو انہوں نے کسی کی خیریت نہیں پوچھی' کسی کا احوال معلوم نہیں کیا۔ شاید بڑی آپا سے ان کے اختلافات زیادہ ہو گئے تھے یا دونوں میں حاکمیت زیادہ آگئی تھی۔
خالو جان کہیں جانے کے لیے تیار تھے۔ لگے ہوئے پائنوں کا ہوا ڈوری سے ان کی کلائی میں لٹک رہا تھا۔ داڑھی کے اڑے اڑے بال' گنجے سر اور پاجامے کے پائنچے اوپر اٹھائے ہوئے جیسے گھر میں کیچڑ ہو۔
"آگئیں صاحب زادی۔" اقصیٰ ان کے حلیے سے ہی نہیں ان کی پذیرائی کے انداز سے بھی ڈرتی تھی۔
"اور کچھ دن رہ آتیں۔ جو ماں کے چٹے بالوں میں دھول جھونکنے کو رہ گئی تھی وہ بھی جھونک آتیں۔" وہ سینڈل کا بکل کھول رہی تھی جو سارے راستے چبھتا آیا تھا۔ تیر کی طرح کھبتے ہوئے خالو کے سنگین لہجے نے سینڈل کی ساری تکلیف بھلا دی۔ وہ جانتی تھی بڑی آپا کی شان میں جو بجو تیار ہے۔ جب تک سنا نہیں لیں گے اور اسے اچھی طرح سہما نہیں دیں گے وہ یہاں سے ہلیں گے نہیں۔
"بھئی بیٹی۔" اب وہ جھاگ میں ڈوبے ہاتھوں والی امی سے مخاطب تھے۔ "تمہارے والد صاحب۔ کم سن نہیں تھے' کم عقل نہیں تھے۔ بے شعور نہیں تھے۔ کوئی تو وجہ تھی جو انہوں نے اس کا وہاں جانا بند کیا تھا۔ تم ایسی خود مختار اور معاملات نبھانے والی ہو گئیں کہ آباؤاجداد باپ دادا بزرگ' سب کے احکامات پر پانی پھیر گئیں۔" وہ پھر جلال میں ڈوبے امی کے پاس آکر بولے۔ "ابھی کیا رو رہی ہو۔ رونا تو پڑا ہے عمر بھر کا۔"
وہ سہم گئی۔ دہشت سے سفید ہو گئی۔ ماں کا رونا اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔
"ارے بھئی۔ وہ بڑھیا جادوگرنی! وہ تو عزت دار شریف لڑکیوں کی قاتل ہے قاتل۔"
اقصیٰ کے لیے اس سے زیادہ ہرزہ سرائی برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی' وہ ویسا ہی تھا بڑا اونچا سا چوڑا سا ویران سا۔
"کوئی جویریہ سا ہو جو ایک منٹ میں سارے گھر کو شیشے کی طرح چم چم کردے۔ کوئی مہ رخ سی شوخی والا۔ کوئی طغرل سا مہربان۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک اقصیٰ اور ایک اس کا وحشت ناک سایہ۔ رات تک وہ اسی

بستر پر بیٹھی دوپٹے کے کونے سے ناک رگڑتی رہی۔ جانے بڑی آپا کی کس بات کو گرفت میں لے کر خالو واویلا کر رہے تھے۔ تین دن سے وہ کمرے میں بند تھی اور اس طرح عدالت کے سامنے اپنے مجرم ہونے کے بیان پر دستخط کر رہی تھی۔ عدالت بھی کہیں دور نہیں تھی۔ کبھی وہ برآمدے میں ان کے جوتے کی ٹھک ٹھک سنتی، کبھی دور سے صحن میں ان کی بڑبڑاہٹ واضح تھی۔ وہ ہر مرتبہ اس کے کمرے کے سامنے سے گزرتے اور بڑی آپا کی شان میں بے ہودہ گوئی کرتے۔ اس سے کھانے پینے کے لیے بھی کوئی اصرار نہیں کیا گیا۔ وہ خود ہی کبھی نکل کر کچھ کھا لیتی ورنہ چوروں کی طرح تکیے میں منہ چھپائے پڑی رہتی۔ اس دن زہیر آئے تو وہ ان کے گلے سے جھول کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ سارے لاہور شہر میں ایک زہیر ہی اس کے ہمدرد تھے، وہی سمجھتے تھے۔

"خدا کی قسم زہیر بھائی! یہ سب جھوٹ ہے۔ بہتان ہے بکواس ہے۔ یہ سب لوگ دشمنی میں الزام لگا رہے ہیں۔ بڑی آپا ایسی نہیں ہیں۔"

زہیر کندھے سے لگی روتی دھوتی اقصیٰ کو سیدھا کر کے بمشکل سکون کا سانس لے پائے۔

"تم نے میرا ایک مشکل وقت بڑی سہولت سے گزار دیا، میں سوچے جا رہا تھا تم اپنی ضمانت قسمیں کھا کر مجھے دے رہی ہو۔ شاید میں اتنا ہی کمینہ ہوں کہ تمہیں اپنا یقین دلانے کے لیے قسم کھانی پڑے لیکن خیر۔"

انہوں نے اس کی شفاف، اجلی اور ایمان سے پر، سادہ آنکھوں میں دیکھا۔ "خیر شکر ہے کہ یہ کچھ تم کسی اور کے لیے کہہ رہی ہو لیکن تم اتنا رو دھو کیوں رہی ہو۔ چلو منہ صاف کرو کپڑے بدلو۔ تمہیں تازہ ہوا لگوا لاؤں۔"

"زہیر بھائی! زہیر بھائی!" وہ گنگ ہو گئی۔ وہ کیسے کہتی تین دن سے وہ یہاں قتل کے مجرم کی طرح بند ہے۔

"خا۔ خالو جان؟"

"خالو جان ہونہہ۔ وہ تمہارے ولی نہیں ہیں۔ اصل میں تمہارے شرعی ولی تو چچا وغیرہ ہیں لیکن۔"

وہ کوئی بری بات کہتے کہتے رک گئے۔ زہیر امی سے کچھ کہنے گئے تھے اور اپنی پر تاثیر زبان میں جانے کیا کہہ کر آئے کہ اجازت دلوا کر ہی لائے۔ خالو جان برآمدے میں ٹہل رہے تھے اور پنجرے میں بند شیر کی طرح بے چین بے قرار، وہ جگہ جگہ پان کی پیک اگلتے غصے سے بلبلا رہے تھے، لیکن وہ زہیر کے منہ نہیں لگتے تھے۔ زہیر کے والدین نے اسے فالتو لفٹ دے کر منہ پھٹ بنا دیا تھا۔ زہیر اسے اپنی سرخ موٹر سائیکل پر سارا شہر گھماتے پھرے۔ تیز ہوا کی چہرے پر چوٹ اور اڑتے بالوں نے اس کے اعصاب کافی مضبوط کر دیے۔ دو ڈھائی گھنٹہ بعد وہ خود ہی اسے گھر ڈراپ کر گئے۔ اس ڈرامے کے اسباب کیا تھے اور اس میں حصہ لینے والے فنکار کون کون تھے اور پس پردہ کون تھا۔ اس سارے سلسلے میں زہیر نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ البتہ برآمدے میں خالو ابھی تک بے چین تھے۔ امی ہاتھ مسل رہی تھیں اور خالہ دبی سہمی امی کے سہارے کے لیے ان کے ساتھ والی تپائی پر آ بیٹھی تھیں۔

"یہ میرا مسئلہ تھا۔" خالو چلا رہے تھے۔ "میں جس طرح مرضی نمٹتا مگر تم نے تو معافی تلافی کر کے حساب ہی صاف کر دیا اور چالاک بڑھیا نے یہ اچھا ڈھونگ رچایا کہ باپ کی زندگی میں مرنے والی اولاد کے بچوں کو حصہ نہیں دیا جاتا، واہ خوب۔ حصہ تو آپ نے اس گھر سے خوب لیا۔ پھر یہ بھی نہ لیتیں۔ یہ بھی چھوڑ دیتیں۔"

امی سر نیچا کیے ہوئے تھیں۔ "پھر آخر ہم کہاں رہتے، یہ میرے ماں باپ کا گھر ہے۔"

"کل سے تم کیمپس جاؤ گی۔ تمہاری کلاسز کا ہرج ہو رہا ہے۔" موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے زہیر چلائے۔ پھر ریس دیتے ہوئے نکل گئے۔ اگلی کسی بات کا ایک لفظ اس کے پلے نہیں پڑا۔ زہیر نے اس سے وعدہ کیا تھا امتحانوں کے بعد جیسے تیسے بھی ہو وہ اسے بڑی آپا

کے ہاں پہنچا کر دم لیں گے۔
خالو کے کھوکتے ہوئے لاوے سے بچنے کا ایک ہی نسخہ تھا۔ وہ دن رات پڑھائی میں مگن ہو گئی۔
وہ اس مرتبہ بڑی آپا کے ہاں سے چپ رہنے کی سوغات ساتھ لائی تھی۔ خالو اور خالہ تو ایک طرف تھے اس نے امی سے بھی بات چیت بند کر دی۔ وہ در حقیقت سب ہی سے مایوس اور بے زار' بے زار ہو گئی تھی۔ صبح کہیں چلی جاتی دوپہر بھر لائبریری میں پڑھتی۔ گھر آجاتی تو سارے دن کے بنائے نوٹس ترتیب دینے لگتی۔ کہیں آنے' کہیں جانے کسی سے ملنے کا تو خالو کے ہاں رواج ہی نہیں تھا۔ کوئی بھولا بھٹکا مہمان آبھی جاتا تو خالو ناراض ہو کر اسے شیطان بنا ڈالتے۔ گمراہ کرنے والا' بے راہ رو کرنے والا۔ لہٰذا وہ سب سے کٹ گئی تھی۔ امی اس سے شرمندہ تھیں یا اس کے لیے دکھی تھیں' کچھ زیادہ ہی اس کا دھیان رکھنے لگی تھیں۔ دودھ کا گلاس لاتیں' وہ غٹ سے چڑھا لیتی۔ کھانے کو بلاتیں تو چپ چاپ کھا لیتی۔ نہ بلاتیں تو نہ کھاتی۔ اسے اپنے اوپر لگائی تہمتوں کا افسوس نہیں تھا۔ انہوں نے بڑی آپا جیسی بے داغ اور شفاف شخصیت پر کیچڑ اچھال کر اقصیٰ کو شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناراض کر دیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس دن زہیر کئی دن بعد آئے اور بڑے موڈ میں تھے۔ دروازے ہی سے وہ بلند آواز میں کسی سے بول رہے تھے اور ہنستے چلے آرہے تھے۔ جب خالو گھر میں ہوں تو زہیر چہکتے نہیں تھے۔ خاموشی سے آتے اپنی اماں کا پیغام امی یا خالہ کو دیتے اس کی خیریت پوچھتے اور چلے جاتے۔ وہ بڑی گرم جوشی سے کسی کا استقبال کر رہے تھے۔ ساتھ ہی اقصیٰ اور امی کو آوازیں دیتے جا رہے تھے۔
"خالہ' اقصیٰ دیکھیں تو کون آیا ہے۔" جیسے کسی کو دیکھا ہو' پہچانا ہو لیکن آنکھوں پر اعتبار نہ ہو۔
تجسس کے باوجود وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکل سکی۔ خالو آئے گئے کا لحاظ کیے بغیر کسی کے سامنے بے پردہ ہونے پر اسے زور سے جھاڑ دیتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنے کمرے ہی میں ہیں۔
امی حسب عادت غسل خانے میں کپڑوں کی پوٹ پھیلائے بیٹھی تھیں۔ انہیں خوف تھا' زہیر کچھ احساس کیے بغیر مہمان کو اندر لیے چلے آئیں گے۔ پھرتی سے انہوں نے قمیص کے دامن سے ہاتھوں سے صابن کا جھاگ چھڑایا۔
"ذرا میرا دوپٹہ تو دے۔" انہوں نے غسل خانے کے دروازے سے جھانک کر اقصیٰ کو آواز دی۔ لیکن اقصیٰ متوجہ نہیں تھی۔ وہ آنے والے کی آواز پر کان لگائے اس کی مانوس سی بول چال پر خود کو جیسے دشمن کے کیمپ میں سمجھنے لگی تھی۔ امی نے خود ہی لپک کر پائے پر جھولتا اپنا دوپٹا اٹھا لیا۔
امی سے پہلے اقصیٰ بڑھی تھی اور آنے والے کے بازو کو سختی سے تھام کر لپٹ گئی۔ "طغرل۔ طغرل بھائی۔"
"ارے۔" امی کے چہرے پر پہچان کی چھپک سی نظر آئی۔ "یہ شمسہ کا بچہ تو نہیں۔"
توقع کے بالکل خلاف امی نے انہیں سینے سے لگا لیا۔ "اتنا سا تھا یہ۔" وہ زمین سے ہاتھ کی اونچائی کا اشارہ کر کے بولیں۔
"دوسری۔ یا شاید تیسری میں پڑھتا تھا۔ تختی پر کٹواں لکھوا تا تھا۔" پرانی یادوں کی ایک کڑی دوسری سے ملتی' رلانے لگی۔ خالو شور شرابا سن کر باہر نکلے۔ امی آنسو پونچھ رہی تھیں۔ اقصیٰ طغرل کا بازو پکڑے ان سے لایعنی سوالوں کی بھرمار کیے تھی اور حیران حیران اور خوش خوش زہیر لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ بڑی خالہ کو ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف تھی۔ لیکن گھسٹتی کراہتی وہ بھی آئیں۔
کھانے کا وقت قریب تھا۔ امی نے صم بکم بیٹھی اقصیٰ کو ٹھوکا مارا۔
"مرغی ذبح کرالو۔"
خالہ اور امی ان سے کرید کرید کر سوالات کر رہے تھے بڑی آپا کا پوچھ رہے تھے۔ بچوں کا اور ان کے بچوں کا

اور طلحہ کے زخموں کا۔ وہ سب تفصیلات سنا رہے تھے سرجن نے ران کی ہلکی سی پرت اتار کر ایڑی پر گرافٹنگ کی ہے اور یہ کہ اس نے بڑی تکلیف اٹھائی۔

"اور بڑی آپا۔" خالہ کہہ رہی تھیں۔ "ان کا دل تو پتھر کا ہے پتھر کا۔ اللہ بخشے بیٹا مرا بیٹی مری۔ ایک بیٹی بیوہ ہوئی لیکن ان کا دل موم نہ ہوا۔ کمر ویسے ہی اکڑی کی اکڑی۔"

طغرل پریشان ہوگئے۔ یہ کیا قصہ چھڑ گیا۔ وہ جانتے بھی نہیں تھے کہ عورتوں کی یلغار سے کیسے نمٹا جاتا ہے۔ وہ اپنا خوف دور کرنے کے لیے ہنسنے لگے "اکڑی کمر۔ آپ اقصیٰ سے پوچھیے وہ تو اردو کے آٹھ کی طرح چلتی ہیں۔" اقصیٰ اس کے کھانے پینے کے اہتمام کے لیے ادھر سے ادھر تیز قدم اٹھاتی خوش خوش پھر رہی تھی۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مجھے جلدی ہے حیدر آباد جانا ہے۔ ہاں یہ بڑی آپا نے کچھ بھیجا ہے۔" اس نے ایک بڑا سا پیکٹ امی کی طرف بڑھایا۔

"ہائیں۔ بڑی آپا کو میری یاد کیسے آگئی۔" واقعی بڑی آپا نے امی کو تو کبھی کچھ نہیں بھیجا تھا۔ امی نے پیکٹ کھولا اس میں کچھ سردیوں کے گرم سوٹ کے کپڑے تھے۔ شال تھی اور سوئٹرز۔ امی حیران رہ گئیں۔ یہ کافی مہنگی چیزیں تھیں۔

ایک لفافہ انہوں نے اقصیٰ کی طرف بڑھایا۔

"یہ ان کے لیے ہے۔" اقصیٰ نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔ وہیں کھڑے کھڑے بے تابی سے چاک کیا اور رک گئی۔

"بے صبر لڑکی۔" بڑی آپا اس انداز میں تو کبھی خط میں لکھتیں۔ وہ اسے ہمیشہ بے صبری کہتی رہیں۔ لیکن جو کبھی کبھار وہ کسی کے ہاتھ سے اسے خط لکھواتی تھیں اس میں تو بڑے پیارے پیارے خطاب ہوتے تھے اور اب؟ اس نے لفافہ بند کر دیا۔ اس نے واقعی بے صبری کا مظاہرہ کیا تھا۔ امی بنڈل میں مصروف تھیں اور خالو ایک سائس میں اسکوائش کا گلاس خالی کر رہے تھے۔ غنیمت ہوا کسی نے دیکھا نہیں۔ امی حیرت اور بے یقینی کی کیفیت میں ایک ایک چیز پھر ول رہی تھیں۔ ابھی چند دن پہلے وہ بڑی آپا سے کس قدر خفا ہو گئی تھیں۔ کسی گرم چادر میں ایک خط بھی تہہ ہوا رکھا تھا۔ یہ خط بھی بڑی آپا کا تھا۔ انہوں نے امی کے نام لکھا تھا۔

"زندگی کا آخر ہے ایک مرتبہ آکر مل جاؤ۔ میں تو سفر کرنے کے قابل نہیں۔ ورنہ خود آجاتی، تم سے مل لیتی۔"

امی جھر جھر آنسو بہا رہی تھیں اور گریہ کی شدت کو روکنے کے لیے دوپٹہ سے کس کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ "سارا قصور میرے میکے کا ہی نکلا۔ اتنی دوریاں ڈال دیں، بچی کو بھی ان کی وجہ سے دور رکھا۔ اب کے میں ضرور جاؤں گی۔ کسی کی بھی زندگی کا کیا بھروسا؟"

یہ اچھا ہوا کہ بڑی آپا نے خود ہی دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ ورنہ ہوا میں معلق وہ تھک گئی تھی بڑی آپا اس مرتبہ... معمول سے زیادہ اداس تھیں۔ شاید طلحہ کی بیماری نے انہیں توڑ دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آئی اور نیلا لفافہ کھول کر پڑھنے لگی۔

"بے صبر لڑکی! میرے صبر کو اور نہ آزمانا۔ کیونکہ میں خار زار حیات میں گھرا لہولہو ہوں۔"

یہ لائن۔ یہ سطر تو دن رات طلحہ پڑھا کرتا تھا۔ خط کے آخر میں کسی کا نام بھی نہیں تھا۔ اسے بہت غصہ آیا۔ یہ تین فقرے اگر خالو کے ہاتھ لگ جاتے تو اس کا بستر اتو گول ہوا ہی تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اسی طرح کسی اور کو یاد کیا تھا۔ مہ رخ اس کے بارے میں ٹھیک ہی سوچتی تھی آج دوستی۔ کل محبت، پرسوں چھٹی۔ اسے تو جویریہ کا بھی لحاظ نہیں اور طغرل کو اعتماد میں لینے کے لیے اس نے کیا بتایا ہوگا اور طغرل نے جواباً کیا سوچا ہوگا۔ شاید میں ان لوگوں میں سے ہوں جو گھر اُجاڑتی پھرتی ہیں۔ انسان کی ہمدردی بھی اسے بہت خراب کرتی ہے۔ کاش کبھی عقل سے ہی کام لیا ہوتا۔ وہ طغرل سے بھی ناراض ہو چلی تھی۔ انہوں نے

بڑی آپا کے خلوص سے بھیجے گئے تحفوں کا ناجائز استعمال کیا تھا۔

اس کے امتحانات ختم ہو گئے اور زہیر کی اجازت دلوانے کے باوجود وہ بڑی آپا کے گھر نہ جا سکی۔ اسے قلق بھی تھا۔ ایک ہلکی سی چبھن بھی۔ وہ سب ہاں وہ سب کیسے ہوں گے۔ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے' یہاں آتے ہی اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ کسی کے علم میں نہ آجائے ان ہی دنوں خالو کو دمے کا بڑا سخت حملہ ہوا تھا۔ چونکہ خالو کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے زہیر ہی ڈاکٹروں کی طرف بھاگ دوڑ کرتے پھرے اور امی خالہ کا سہارا بنی رہیں۔ اس کے امتحانات مدت ہوئی ختم ہو گئے تھے اور اب فارغ ہی فارغ تھی۔ وہ خالو کی نرس تو نہیں تھی' خالو کا سانس سینے میں آکر رک جاتا۔ انہیں سانس بحال کرنے میں شدید تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا۔ کبھی وہ جھک کر دوہرے تہرے ہوتے کبھی سیدھے۔ کربناک چیخوں سے ان کا چہرہ نیلا پڑ جاتا۔ تب کہیں وہ ایک سانس لے پاتے' ایسے میں اقصیٰ کو لگتا انہیں اگلا سانس آئے گا ہی نہیں لیکن اگلا سانس تو آجاتا لیکن اس سے اگلا سانس خرخر بولتے سینے میں اٹک اٹک جاتا۔

اقصیٰ کا دل چاہتا۔ وہ انہیں معاف کر دے۔ پھر اس کے ذہن میں چار سال کی عمر کے بعد کا ایک ایک لمحہ پٹڑی پر رینگنے لگتا۔ وہ جب ربن باندھنے پر اس کے بال نوچتے تھے۔ قرآن کی غلطی کرنے پر سر دیوار میں دے کر مارتے تھے۔ جب غصے میں اسے پیٹتے پیٹتے بے حال ہو جاتے تو اس کی کاپیاں کتابیں اس کا بستہ سب جلا دیتے۔ اس کا ہوم ورک ضائع ہو جاتا۔ اس کی پیاری کتابیں کالی راکھ بن جاتیں اور وہ اسکول میں غیر ذمہ داری کی وجہ سے مار کھاتی کیونکہ اس کی رپورٹ بُری آتی تھی۔ ایب نارمل تھی اور بری رپورٹ پر خالو پھر پیٹتے تھے۔

خالو کا سانس پھر اٹک گیا۔ وہ اپنے بال نوچنے اور پلنگ کی پٹی پر سر مارنے لگے۔ اقصیٰ کو یقین تھا خدا ایک دن ان سے اس کا بدلہ ضرور لے گا۔ شاید یہ بدلے کی گھڑی تھی وہ خالو کو خدا سے معافی دلوانے لگی۔ "اگر یہ میری تکلیفوں کا عذاب ہے تو میں معاف کرتی ہوں۔"

خالو دمے کے ہر حملے میں رقیق القلب ہو جاتے تھے۔

"فاخرہ بیٹی! مجھے معاف کر دینا۔" وہ امی سے مخاطب تھے۔ "میں نے تمہارے ساتھ زیادتیاں کیں۔ یہ اسی کا بدلہ ہے۔

میں تمہیں تمہاری جائیداد واپس کرتا ہوں۔ ابھی وکیل کو بلواؤ۔ ابھی وصیت لکھواؤ۔ تمہارے ابا کی جائیداد میں تینوں کا حصہ برابر ہو گا۔ میں کون۔ اکیلا۔"

اقصیٰ جانتی تھی۔ ہر سردی میں خالو کو دمے کا حملہ ہوتا ہے اور ہر گرمی وہ سردیوں کی باتیں بھول جاتے ہیں۔ زہیر ڈاکٹر کو لینے گئے تھے۔ بڑی خالہ امی کے گلے لگ کر رو رہی تھیں لیکن خالو کی مشکل آسان نہیں ہو رہی تھی۔

"میں حصہ لے کر کیا کروں گی بڑے بھائی۔" امی نے آنسو خشک کر لیے۔ "میرے دل میں کوئی ملال نہیں۔"

"اور میرے دل میں؟؟" اقصیٰ نے سوچا۔

"میں نے آپ کو معاف کیا خالو جان! خدا آپ کی مشکل گھڑیاں آسان کرے۔" وہ دروازے میں جمی تھی۔ خالو کو اچانک آرام آگیا۔ وہ سکون سے لیٹ گئے لیکن امی اور خالہ بے آرام ہو گئیں۔ وہ چیخ کر لپکیں اور زہیر کے آنے سے پہلے خالو تمام مراحل سے خود ہی گزر گئے۔

موت' قل' چھٹی' دسواں۔ صحن ہر وقت عورتوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہ بہت بہادر ہونے کے باوجود اسی گھڑی سے چھپتی پھرتی تھی۔ بڑی آپا کے گھر کسی کو اس واقعے کی اطلاع بھی نہیں تھی۔ وہاں سے خالو کی بیماری کے زمانے سے بلاوے کے خط آرہے تھے۔ آخری خط میں لکھا تھا "بڑی آپا سخت بیمار ہیں۔ جس طرح بھی ہو سکے فوراً پہنچو۔"

امی بلبلا کر رو پڑیں۔ انہوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اقصیٰ کی تیاری کرادی۔ "تم پہنچو بس۔ مجھ سے جتنی جلدی ہو سکا۔ میں آجاؤں گی۔ ایسے میں آپا کو اکیلا چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتی۔ خدا بڑی آپا کو زندگی دے۔ مجھے ان کا منہ دیکھنا نصیب ہو۔"

انہوں نے اکیلے کا لحاظ کیا نہ دکیلے کا۔ اسے چلتا کرنے کی' کی۔ حالانکہ یہ وہی گھر تھا جہاں سے وہ چند ماہ قبل واپس آئی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مایوس ہو گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ اتری تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ دھوپ مردہ مردہ تھی سائے گھنے اور لمبے ہو گئے تھے۔ سردیوں کی اس خاموش سہ پہر نے سارے صحن کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ گھر میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ برآمدوں میں کمروں میں' باورچی خانے میں۔ جو جگہ بھی سامنے تھی وہاں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ کہیں کچھ ہو تو نہیں گیا۔ کہیں اس نے آنے میں اتنی دیر تو نہیں کردی کہ...

وہ لان کے درمیان سے گزرنے والی روش پر ساکت وجامد کھڑی تھی کہ اس نے اندرونی عمارت سے ایک نعرہ سنا۔

"بی بی آگئیں۔ اے بڑی آپا سنتی ہو۔ میری بی بی آگئیں۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اندر آئی تو بڑی آپا آنکھیں ملتی اپنے کمرے سے ہولے ہولے قدم اٹھاتی نکل رہی تھیں۔ وہ بھول گئی۔ سارے دن میں یہی وقت تو ان کے آرام کا ہوتا تھا۔ وہ خجل سی کھڑی تھی لیکن بڑی آپا نثار ہونے لگیں۔ وہ اسے جدا کرتے وقت ہی نہیں مل کر بھی روتی تھیں' لیکن اب کے مل کر تو اقصیٰ بھی رو دی۔ وہ بڑی آپا کے گلے لگی تھی اور چھم چھم آنسو بہا رہی تھی۔

"یہ اچانک کیسے آگئی تو۔ میں تو سوچ رہی تھی دو مہینے ہو گئے۔ نہیں آئی تو جی نہ اچھا ہو گا۔ میں نے بھی صبر کرلیا' دل مار لیا۔ کیوں بار بار کہوں۔ اس طرح بچی بھی کسی ایک ٹھکانے کی نہیں۔"

"بڑی آپا؟" وہ رونا دھونا بھول کر ان کے کندھے سے سر اٹھا کر حیرت سے دیکھنے لگی۔

"تو پہلے کیوں نہیں آئی؟"

"خالو فوت ہو گئے۔ بڑی آپا۔" اس بات کا اس بات سے کوئی واسطہ تو نہیں تھا۔ پتا نہیں اس کے منہ سے کیوں نکل گیا۔ بڑی آپا انا اللہ پڑھنے لگیں اور بخشش کی دعائیں۔

اقصیٰ سوچ رہی تھی۔ یہ گھناؤنی سازش طلحہ صاحب کے سوا کس کی ہو سکتی ہے۔ کیا تو وہ زور شور سے رو رہی تھی' کیا امنڈتے برستے آنسو ایک دم خشک ہو گئے۔ اب اس پر غصہ اور جھنجلاہٹ طاری ہو گئی تھی۔ اگر اس نے طلحہ کو کچھ کہا تو وہی اپاہج پن کو درمیان میں لاکر نمبر بڑھوالیں گے۔ رمضانو اس کے لیے چائے بنانے لگی۔ بڑی آپا نے اس سے کہا منہ دھولے۔ تھکان اور رنج کی وجہ سے اس کا چہرہ ست گیا تھا۔ اس نے صحن میں کپڑے دھونے والے نل کے کنارے سیمنٹ کی بنی ہوئی کنی پر بیٹھ کر چھپکے مارے۔ بڑی آپا کے تخت کے پردے پر ہمیشہ ایک ستھرا سا تولیہ لٹکا رہتا تھا۔ اس نے منہ خشک کرنے کے لیے تولیہ رگڑا اور دل ہی دل میں اسی بہانے قسم کھالی کہ بچو تم سے انتقام لیے بغیر چین نہیں لوں گی۔

رمضانو چائے لے آئی۔ وہ خوش باش موڈ میں تھی۔

"ذری جلدی ننھ بجیو۔ میں ساتھ گلگلے تل رہی ہوں۔"

وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگی۔ حسب حکم۔ "اور سب لوگ کہاں ہیں بڑی آپا۔"

بڑی آپا اس پر واری صدقے ہو رہی تھیں۔ کبھی بالوں سے کوئی تنکا چھڑاتیں' کبھی کپڑوں سے نامعلوم گرد جھاڑتیں۔

پھر خوش ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگتیں۔ جب وہ بہت خوش ہوتیں تو سروتے سے چھالیہ کتر کر ڈھیر بھی کرتی جاتیں اور باتیں بھی۔

"جویریہ کی جماعتن کی شادی تھی۔" انہوں نے اُگالدان تخت کی اونچائی تک لا کر تھوکا۔

"سب کی سب وہیں گئی ہیں۔ تیرا جی چاہے تو تو بھی ہو آ۔ پڑوس ہی میں ہے۔"

"نہیں بڑی آپا۔" وہ ان کے لمبے چوڑے تخت پر وہیں ٹانگیں زمین پر جھلا کر لیٹ گئی۔ "میں اب تھک گئی ہوں۔" سارے ناز و ادا بڑی آپا کو دیکھ کر خود بخود آجاتے تھے۔

"طغرل تو حیدر آباد چلا گیا اور طلحہ۔ طلحہ اپنے کمرے میں۔ ارے ہاں۔" بڑی آپا کو یاد آیا۔

"طغرل کہہ رہا تھا جاتے ہوئے۔ تیرے ہاں ہو کر جائے گا۔ میں نے کہا بھی۔ خالو خالہ اس کے مزاج کے اچھے نہیں خدا بخشے۔ پر وہ ضد میں آگیا۔ میں نے کہا جا بھئی کر اپنی ضد پوری۔"

"امی کو آپ کی بھیجی ہوئی چیزیں بہت پسند آئیں۔"

"چیزیں؟" بڑی آپا کی تیوری پر حافظے کے زور سے افقی شکنیں پڑ گئیں۔ "اچھا وہ حلوہ۔ چنے کی دال کا سچ پوچھو تو مہ رخ نے بنایا۔ میں نے تو دخل بھی نہیں دیا۔"

"لیکن بڑی آپا۔" وہ ہونٹ کاٹ کر پھر چپ ہو گئی، رمضانو گلگلے لے آئی تھی اور بڑی آپا مغرب کے لیے وضو کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔

یکے بعد دیگرے فراڈ۔ آخر اس گھر میں کون اتنا بڑا فراڈی آگیا ہے؟ کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس سے دو دو ہاتھ کیے جائیں۔

وہ اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ دروازہ کھول کر ہولے ہولے قدم اٹھاتا وہ خود اس کے سامنے آکھڑا ہوا، تو اس کا مطلب۔ خوشی سے اس کے منہ سے پھسلا۔

"مبارک ہو۔" وہ مسکرا رہا تھا اور پاؤں قدرے گھسیٹ کر اس کے پاس سے گزر گیا۔ گزرتے گزرتے اس نے رسماً سا کہا۔

"خیریت سے پہنچیں۔ اچھی تو رہیں۔"

وہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔ اس کے اٹھتے گرتے قدموں کا حساب کر رہی تھی کہ کتنے قدم تھے۔ کتنے منٹ میں اٹھائے گئے۔ تو آٹھ نو ماہ کی طویل بیماری بھگت کر اب وہ صحت یاب ہے، تب ہی خوش نظر آرہا تھا۔ خدا نے اس کی زندگی کا، اس کے حصے کا چین اسے لوٹا دیا تھا۔ اس نے دو دو ہاتھ کرنے کا ارادہ پھر کبھی پر ٹال دیا۔

مہ رخ جویریہ وغیرہ عشاء کے قریب آئیں۔ وہ کمرے میں جا کر لیٹ بھی گئی تھی۔ اسے دیکھ کر خوشی سے اچھلنے کودنے لگیں۔ فیروزہ نے اس کا حال احوال پوچھا۔ اسے جلدی تھی۔ ان دنوں اختری چچی کے گھٹنوں کی تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی۔ وہ سارا دن چھت پر بیٹھی دھوپ میں گھٹنے سینکتی رہتیں۔ رات ہوتی تو ہیٹر کے سامنے آن بیٹھتیں صرف اسی طرح انہیں آرام تھا ورنہ شدید تکلیف اٹھا رہی تھیں۔ اتنی دیر میں اسے چچی اختری کی یاد بھی نہیں آئی تھی۔ فیروزہ فوراً ہی چھت پر چلی گئی۔ اقصیٰ چچی کی خیریت دریافت کرنا چاہتی تھی۔ فیروزہ اسے بھی اپنے ساتھ لیتی گئی تھی۔

"امی سارا دن اوپر کے کمروں میں رہتی ہیں، اوپر ذرا گرم ہوتا ہے نا۔"

"آئے میں واری، میں صدقے، میں قربان۔" اختری چچی نے وہیں بیٹھے بیٹھے اس کا سر ماتھا چوم لیا۔

"کیا کروں ٹانگوں سے معذور بیٹھی ہوں۔ کب سے نیچے سے آوازیں سن سن کر خوش ہو رہی تھی۔ میری بچی آئی ہے۔ پر اٹھوں کیسے۔ جاؤں کیسے۔ ماں کی سنا۔ خوش ہے اور خالہ خالو آئے ہائے۔ انا اللہ اللہ صبر دے۔ میری تو زندگی میں اللہ رکھے ایک فیروزہ اور جیتا رہے یہ طلحہ۔ خدا اسے چاند سی دلہن دے۔"

ارے تو طلحہ صاحب یہاں براجمان تھے۔ واہ بھئی اب کہیں اور دال نہیں گلتی ہوگی تو فیروزہ ہی سہی اور چاند کا تو کہنا ہی کیا وہ تو آپ کے ہی کمرے میں طلوع ہو کر غروب ہوتے ہیں۔ چچی صاحبہ کے ہی مزاج دیکھو جیسے کبھی اس شخص کی دشمن نہ رہی ہوں۔

اسے وہ تکلیف دہ واقعہ آسانی سے تو نہیں بھول سکتا تھا۔ لیکن طلحہ صاحب آسانی سے سارے قصے چکا بیٹھے تھے۔

"اے فیروزہ۔ بہن کے آگے کچھ رکھ۔" اتنی خاطر مدارات' ایسا شہد لہجہ۔

"نہیں چچی بس۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "بڑی آپا کھانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ میں تو صرف آپ کو دیکھنے آگئی تھی۔"

اختری چچی کے گھٹنوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ ان کی چھنیاں کمزور ہو گئی تھیں لیکن آنکھوں کے ڈیلے اسی طرح تھے۔ متحرک' گھومتے' ناچتے۔

ایک لمحے میں ہی انہوں نے پتلیاں گھما کر سر سے پاؤں تک اقصیٰ کو دیکھا اور اس کے ساتھ ہی معذرت کر کے اٹھتے طلحہ کو۔ باری باری اور بار بار دونوں کو دیکھنے کے بعد' ان کی بولتی آنکھوں نے فسانے تراشنے شروع کر دیے۔

وہ سیڑھیاں مشکل سے اتر رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے ریلنگ۔ پکڑ رکھی تھی۔ اچھی والی ٹانگ نیچے اتار کر وہ زخمی ٹانگ گھسیٹ لیتا۔

"ڈاکٹر نے مجھے فی الحال چھڑی استعمال کرنے کے لیے کہا ہے' لیکن یہ میرا کومپلیکس ہے میں نہیں کرتا۔" وہ خود سے مذاق کر رہا تھا لیکن اقصیٰ سنجیدہ تھی۔

"لیکن آپ کو سیڑھیاں چڑھنے جیسی ایکسرسائز ابھی نہیں کرنی چاہیے۔ مگر اوپر شاید۔" وہ چپ ہو گئی۔

"خبردار' کوئی بودی بات نہ کہنا۔ میں تمہارا بڑا ہی احترام کرتا ہوں۔"

"وہ تو میں بھی کرتی تھی کبھی مگر۔"

"تھی اور مگر۔ یہ درمیان میں کیا آگیا؟"

"آپ کو شرم نہیں آتی۔ آپ نے بڑی آپا کے بارے میں ایسی گندی غلط بیانی کر کے مجھے بلایا ہے۔"

وہ چپ چاپ سیڑھیاں اترتا رہا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ تھا اور سانس تیز تیز۔ بیس پچیس سیڑھیاں طے کرنے میں اس نے کافی وقت لیا تھا۔ ابھی وہ آخری سیڑھی پر تھا کہ بتی چلی گئی۔

"عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے۔ جب لوگ کہا کریں گے۔ زلزلہ آیا ہے طلحہ کے گناہ۔ سیلاب آئے ہیں طلحہ کی بے غیرتی۔ لوڈشیڈنگ ہوئی ہے طلحہ کی غلطی۔" اس کے گھسٹتے قدموں کی چاپ اس کے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

وہ ٹٹولتی ٹٹولتی باورچی خانے میں چلی گئی۔ رجب دین ماچس کھنکھنا تا سوئی گیس کے لیمپ روشن کر رہا تھا۔ باورچی خانہ خوب گرم اور آرام دہ تھا۔ توے پر روٹیاں پکنے کی سوندھی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے گرم اترتی روٹی کا پاپڑ چبانا شروع کر دیا۔ بڑی آپا نے بڑا اہتمام کروایا تھا اور رمضانو نے دل لگا کر کیا تھا' لیکن کھانا تو اب نو بجے بجلی کے آنے پر ہی ملنا تھا۔ وہ لڑکیوں کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ پھر تیم روشنی نیم اندھیرے میں ان کو آوازیں دیتی گھر بھر میں گھوم گئی۔

"یہاں آجاؤ نا۔ تم کہاں بھٹکتی پھر رہی ہو۔"

وہ سچ مچ ہی بھٹکتی پھر رہی تھی۔ اگر یہ خط طلحہ نے نہیں لکھا تو پھر دوسرا کون ہے؟

جویریہ نے ٹیبل پر رکھی کینڈل اسٹینڈ کو ماچس دکھا دی۔ مولی سی موم بتی کا ننھا سا شعلہ ابھرا۔ ہوا کی زد سے بچانے کے لیے اس نے دونوں ہتھیلیوں کا سہارا دیے رکھا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں۔ میں نے تمہیں اتنا ڈھونڈا۔" وہ موم بتی کے پاس ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"میں اختری چچی کی طبیعت پوچھنے۔"

"وہ بیمار تھوڑی ہیں۔ فراڈ ہیں فراڈ بلکہ اختری چچی کی اپنی زبان میں فیراڈ۔ ساری جدوجہد طلحہ کی ہمدردی لینے کے لیے۔ ائے بچے۔ تو آتا ہے تو میں جی اٹھتی ہوں اسی لیے تو جھوٹی سچی باتیں لکھ کر میں نے تمہیں بلایا ہے۔"

"تم نے؟" وہ شرمندگی میں غوطے لگانے لگی۔ وہ خط تمہارا اپنا تھا؟ تمہاری طرف سے۔ لیکن نیچے تو

بڑی آپا لکھا تھا، لیکن جویریہ تم مجھے یونہی لکھ دیتیں ایسے گھناؤنے بہانے کی کیا ضرورت تھی اور اب تمہارا کیا ارادہ ہے، میں طلحہ کو فیروزہ کے چنگل سے نکال کر اپنے دام زلف میں گرفتار کروں۔ آخ تھو۔ جویریہ، جو لوگ خوش خوش کنویں میں کودنا چاہتے ہیں تم انہیں کیوں بچاتی ہو۔"

"ارے نہیں۔ وہ فیروزہ سے عشق نہیں کرتے مجھے پتا ہے۔ وہ تو اختری چچی کی سمجھ میں آگیا ہے کہ ٹانگ کی تکلیف ایک ایسی تکلیف ہے کہ اب کسی کے بھی ہو گی تو طلحہ تڑپ اٹھے گا۔ وہ اس درد کا اصل اندازہ کر سکتا ہے، اسی لیے تو خاتون اتنی شدید تکلیف میں مبتلا ہیں۔ ارے اقصیٰ۔ اختری چچی بڑی چالاک ہیں۔"

"ان سے زیادہ تو تم چالاک ہو۔" اقصیٰ ہنسنے لگی۔ "جو لوگوں کو چالاکیاں بھی نہیں کرنے دیتیں۔ لیکن تم آخر کس کس سے طلحہ کو بچالو گی۔ تم اس حقیقت کا سامنا کیوں نہیں کرتیں کہ وہ تمہارا نہیں ہے۔ لعنت بھیجو اس پر۔"

پیلے رنگ کے ننھے سے ٹمٹماتے شعلے میں اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ "وہ کبھی میرا نہیں تھا۔ وہ میری خواہش بھی نہیں تھا۔ میں تمہیں ایک بات بتاتی ہوں، اب تو وہ بھی ایک بھولا بسرا خواب بن گئی ہے۔ ایک شخص تھا۔ احمد مصطفیٰ۔ وہ نوجوانوں میں بڑا مقبول شاعر تھا۔ ہم نے اسے اپنے کالج کے مشاعرے میں بلایا۔ میں کالج کی لٹریری سوسائٹی میں تھی۔" وہ ہچکچائی۔ جیسے کچھ چھپانا کچھ بتانا چاہتی ہو۔ "وہ اخبار میں کام کرتا تھا اور اس کا آف ڈے بدھ تھا۔ ہم بدھ کے بدھ آپس میں ملنے لگے بس پھر ایک مرتبہ ہم دونوں کو طلحہ نے دیکھ لیا۔ اس نے مجھ کو بلا کر باز پرس کی۔ اس کے بھی کان اینٹھے۔ رقابت میں نہیں، اچھے بھائیوں کی طرح۔ اور اس نے نصیحت کی کہ جویریہ ہماری باعصمت بہن ہے۔ لہٰذا چوری چھپے کی ملاقاتوں کے بجائے اپنی ماں کو ہمارے ہاں بھیجو۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ ان دنوں وہ ادبی وفد کے ساتھ ملائشیا جانے والا تھا۔ ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے یہ ان دنوں کی بات ہے جب گرمی کی چھٹیوں میں تم یہاں تھیں۔ طلحہ نے مجھ سے شادی سے انکار کا ڈرامہ پہلے رچایا، تاکہ حالات سازگار ہو جائیں اور میرا نام ملوث نہ ہو۔ تم سوچو وہ اتنا عظیم انسان ہے اور میں دن رات روتی رہی اور اس سے ڈرتی رہی کہ ابھی وہ کسی سے کہہ دے گا۔ کسی اور سے تو کہنا کیا اس نے تم سے بھی نہیں کہا۔ حالانکہ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس غلط فہمی میں وہ تمہیں ہمیشہ کے لیے گنوا بھی سکتا ہے، لیکن اقصیٰ طلحہ بڑا آدمی ہے، اس میں بڑے آدمیوں والی ساری خوبو ہے۔"

موم بتی کی روشنی کا شعلہ اس کے چہرے پر تھرک رہا تھا۔ اقصیٰ پچھلی دیوار پر اس کے ہلتے ہوئے سائے کو دیکھتی رہی۔

"اور وہ احمد مصطفیٰ؟"

"وہ تو ملائشیا چلا گیا اور اس ڈیڑھ ماہ میں، میں پوسٹ آفس کے چکر لگا لگا کر تھک گئی۔ اس نے جانے سے پہلے مجھے ایک پوسٹ بکس لے کر دیا تھا۔ ہر روز میں کسی نہ کسی بہانے پوسٹ آفس جاتی، لیکن وہ پوسٹ بکس ہر روز خالی ملتا۔ طلحہ نے مجھ سے کبھی مزید باز پرس بھی نہیں کی۔ ان دنوں میں پاگل ہو گئی تھی اقصیٰ! دن رات روتی رہتی سب کہتے تھے جویریہ اس لیے روتی ہے کہ طلحہ نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ طلحہ سب کچھ سنتا تھا اور کسی بات کی تردید نہیں کرتا تھا۔ طلحہ بڑا اعلا ظرف ہے۔ اختری چچی نے ایک مرتبہ اس سے میرے بارے میں بڑے عجیب سوال جواب کیے۔ گھٹیا قسم کے کہ تمہیں جویریہ کیسی لگتی ہے شکل کیسی ہے۔ عقل کیسی ہے وغیرہ۔ اس نے جچے تلے محدود سے جواب دیے کہ ہاں اچھی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ ہر اچھی چیز انسان جیب ہی میں ڈال لے۔ اختری چچی نے بڑی آپا سے آکر جڑا کہ وہ کہتا ہے جویریہ ایسی لڑکی ہے میں کبھی جیب میں بھی نہ ڈالوں سوچو اگر وہ تردید کرتا۔ تو لوگ کہتے پھر تم اس سے شادی کیوں نہیں کرتے؟ بڑی آپا

اس سے ناراض ہو گئیں' سارا گھر اس سے ناراض ہو گیا لیکن اس نے زبان نہیں کھولی۔ میں اسے کس حد تک سزا دوں' اقصیٰ اور کس جرم کی۔ اس نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ ماں باپ بے چارے کے نہیں ہیں۔ بڑی آپا۔ میرے امی ابا سب لوگ۔ سب کے دلوں سے اپنا اعتماد۔ اپنا پیار سب گنوا دیا۔"

"اور وہ احمد مصطفیٰ؟" اقصیٰ جیسے اسی سوال پر اٹک گئی تھی۔

"احمد مصطفیٰ۔ امیگریشن والوں نے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش تو بہت کی۔ شوکاز نوٹس بھی آئے لیکن اتنی بڑی دنیا اسے نگل گئی۔"

وہ چپ ہو گئی۔ دونوں طرف تکلیف دہ سناٹا تھا کہ اچانک بجلی آگئی۔ ٹی وی نیوز نشر کر رہا تھا' لیکن جو خبریں اس نے سن لی تھیں۔ اس کے بعد مزید کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ جویریہ کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ جانے طلحہ کے لیے یا احمد مصطفیٰ کے لیے۔

بڑی آپا کے گھر کا ہر وقت کا تناؤ اب اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ وہ اپنے رویے پر پشیمان تھی۔ وہ طلحہ کو کافی برا بھلا کہہ چکی تھی اور اس بات کے امکانات بھی نہیں تھے کہ گھر کا کوئی فرد طلحہ کو معاف کرے۔ ویسے بھی ان دنوں وہ اکڑا اکڑا سا تھا' اور اپنی سابقہ سرگرمیوں پر واپس جا رہا تھا۔ گو اب زندگی میں وہ تیزی اور روانی تو نہیں تھی لیکن اس کا ایک حصہ تو اسے مل ہی گیا تھا۔ کیا جانے وہ پھر مصباح کے پاس جانے لگا ہو اس کی اولین محبت۔ اس سے تو کہیں اچھا تھا۔ وہ جویریہ کو سہارا دیتا لیکن اس کی سنتا کون تھا؟ اور وہ خود تو اس کی الزام تراشی کے بعد بالکل ہی اجنبی بن گیا تھا اور دوپہر کو گھر آتا۔ ساری دوپہر وہ خود کو کمرے میں بند رکھتا' شام کو باہر جاتا تو رات پڑنے پر آتا۔ وہ جان بوجھ کر لوگوں کا سامنا نہیں کر رہا تھا۔

اپنی دانست میں اس نے صحیح فیصلہ کیا۔ اس نے طلحہ کو عین اس وقت جا لیا۔ جب وہ آرام کرنے کی غرض سے پردے گرا رہا تھا۔

"آیئے۔" وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ "آپ نے پہچانا یہ وہی کمرہ ہے۔"

"میں تو پہچانتی ہوں' آپ بھول گئے ہیں۔"

"پھر شکوہ۔ پھر طعنہ۔ جانے آپ کی رنجشیں کیا کیا ہیں' ابھی تو باقی لوگوں کا حساب نہیں چکایا تھا۔"

"خیر فرمایئے۔ کہیں اس دن والی گفتگو کا بقیہ تو۔"

"میں آپ سے کہنے آئی تھی۔ آپ جویریہ سے شادی کر لیں۔" وہ تمہید کے چکر میں پڑتی تو وہ اسے الجھائے جاتا۔

"ارے اچھا۔ لیکن آپ نے سنا نہیں۔ ان سے شادی کرنے سے میں نے انکار کر دیا ہے۔"

"جویریہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

وہ چپ چپ تھا۔ بیگانہ بیگانہ اور اجنبی اجنبی سا۔

"پھر اس کے بعد تو آپ کو میری خطائیں معاف کر دینی چاہیے تھیں۔ معاف کیجیے آپ شاید بیٹھنے کی نیت سے نہیں آئیں' لیکن میں تھکا ہوا ہوں' آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ صریحاً" اس کی توہین کر رہا تھا۔ لفظوں کو معتبر بنا کر اسے کمرے سے نکل جانے کا حکم دے رہا تھا۔ ایک دم اسے بے عزتی کا احساس ہوا۔ توہین کے کوندے لپکے' لیکن وہ اپنے لیے تو کچھ مانگنے نہیں آئی تھی۔ کبھی انسان کو زندگی میں محبت کا قرض اتارنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ آج شاید وہی دن تھا' جب وہ بڑی آپا کے قرض سے سبکدوش ہو جاتی۔ انہیں ان کی ذمے داریوں سے ہلکا پھلکا کر جاتی۔

وہ اپنی آرام کرسی پر دراز ہو چکا تھا۔ اس نے جوتے اتارے۔ پاؤں سے جرابیں کھینچیں' اس کے بائیں پاؤں کی ایڑی کٹی ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے اس کے جوتے کی شکل مختلف تھی۔ اس نے پاؤں اس طرح پھیلا لیے جیسے وہ آرام کرنے کی نیت سے ہو لیکن دراصل اس طرح وہ اسے اپنی بدوضع ایڑی دکھا رہا تھا۔ اس سے قبل اس نے اس کا پاؤں دیکھا ہی نہیں تھا پہلے پلاسٹر چڑھا رہا۔ پھر پٹیاں بدلی جاتی رہیں۔ تب وہ شاید خود بھی آگاہ نہیں تھی۔ لیکن ایک بات وہ بھول رہا تھا کہ وہ اس کی زندگی میں... بھاگتے دوڑتے

قدموں میں شامل نہیں ہوئی تھی۔ تب تو وہ اس سے زیادہ بدہیت تھا پلاسٹر میں جکڑا ہوا اور جگہ جگہ زخموں کے نشانات اب وہ ایڑی لے کے بیٹھا تھا۔ اس نے تو تب بھی اس حادثے پر اس سے کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔

"آپ جویریہ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔" وہ اپنی جگہ اڑی رہی۔

"جویریہ سے کر لوں۔ اچھا؟ آپ سے کیوں نہیں؟" وہ غیر سنجیدگی سے ہنس رہا تھا۔ اس پر طنز کے تیر پھینک رہا تھا۔

"جویریہ نہیں تو میں کیوں؟ دنیا چھوٹی تو نہیں۔" اس نے اس کے تیر کند کرنے کی کوشش کی۔

"ہاہ۔ مرحومہ انگرڈ برگ مین سے کر لوں؟ میں اپنے حلقے کی بات کر رہا ہوں۔"

"آپ اپنی ذات کے بارے میں بڑے فکر مند لگتے ہیں۔ مت بھولیے کہ آپ بھی ایسی کوئی چیز نہیں کہ۔" وہ غصے میں پلٹی تھی اور دروازے تک پہنچ گئی تھی کہ بازو پر اس کی سخت گرفت سے ایک جھٹکا لگا۔ وہ اس کے نزدیک ہی تھا غصے سے اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔

"میں اپاہج نہیں ہوں بی بی اقصیٰ! کہ آپ بات ادھوری چھوڑ کر دوڑ لگا دیں اور میں ترستا رہوں۔"

"اپاہج تھے تو اچھے بھلے تھے۔ اب تو آپ نرے بدتمیز ثابت ہوئے ہیں۔" وہ اس کی توقع کے برخلاف ہنس پڑا۔

اس کا خیال تھا وہ اس پر چیزیں پھینک پھینک کر مارے گا۔ غصے میں بھنائے گا اور کیا عجب جوا سے ہی پھینک مارے، لیکن اس نے چولا بدل لیا۔ بے کسی کے احساس سے نجات مل جانے پر وہ کتنی دیر تک ہنستا رہا، وہ اسے زبردستی واپسی لے آیا تھا۔ زبردستی ہی اسے کرسی میں ٹھونس دیا تھا۔ وہ ابھی ہنس رہا تھا لیکن محبت سے۔

"تم وہ واحد شخصیت ہو، جس نے اچھے زمانے میں مجھے منہ نہیں لگایا۔ بیمار ہوا تو تم میرا سہارا بن گئیں۔ تندرست ہو گیا ہوں تو سارا کارنامہ جویریہ کی جھولی میں ڈال رہی ہو۔" اسے بھاگنے سے باز رکھنے کے لیے اس نے کرسی کے ہتھے پر اپنے بازو جما لیے تھے۔

"بیماری سے پہلے میرا زمانہ تھا، میرا گلیمر۔ وہی میں کہ بیمار ہوا تو سب لوگ ایک ایک کر کے چھوڑ گئے، اب جب میں دوبارہ زندگی کی طرف واپس آنے لگا ہوں تو وہی بھولے بسرے لوگ میرے اردگرد آ گئے ہیں حتیٰ کہ ان میں وہ بھی شامل ہیں جن پر اپنے خیال میں تو میں نے بڑا بھاری احسان کیا تھا لیکن۔"

"آپ جویریہ کی بات کر رہے ہیں نا۔ وہ بے چاری تو۔"

"شش شت۔ کسی کی بات نہ کرو۔" اس نے دو زانو بیٹھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "صرف اپنی بات کرو میری اور تمہاری۔" اس کی آنکھوں میں محبت روشنی کی طرح جگر جگر کر رہی تھی۔ "بائی داوے میں جویریہ کی بات نہیں کر رہا تھا۔"

♥ ♡ ♡ ♥

اگلا روز ایک انہونا ٹیلی گرام لایا تھا۔ جو ہاتھ در ہاتھ جا رہا تھا اور بڑی آپا ہر ایک سے سننے کے باوجود اعتبار نہیں کر پا رہی تھیں۔ ٹیلی گرام اقصیٰ نے دیکھا تو بے ساختہ بول پڑی۔

"ہاں۔ امی کو تو میرے ساتھ ہی آنا تھا لیکن۔" وہ آگے چپ رہی۔

بڑی آپا امی کی آمد پر گھر بھر میں ایک تہلکہ مچا دینا چاہتی تھیں اور اعتبار کر کے بھی نہیں دے رہی تھیں، کتنے عرصے بعد لوگوں نے ان کا تخت خالی دیکھا۔ وہ ہر ایک سے کہتی پھرتی تھیں۔ "وہ سولہ سال بعد آ رہی ہے۔ سولہ سال بعد اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے۔ آپ سے آپ، دیکھو اس کا ظرف تو مجھ سے بڑا ہی نکلا۔"

وہ جلدی جلدی رجب دین اور رمضانو پر برستیں کہ ان کے ہاتھ پاؤں تیز نہیں چلتے۔ طلحہ اس جھگڑے سے بے نیاز تھا اور بالکل نارمل نظر آ رہا تھا۔ جویریہ اس اہتمام میں سارا گھر چمکا رہی تھی۔ وہ عام دنوں سے زیادہ تردد کر رہی تھی۔ اس کو اس قدر لگن سے کام

کرتا دیکھ کر طلحہ ٹھٹک گیا۔
"کیا ممانی اکیلی آرہی ہیں؟"
"نہیں ساتھ زہیر بھی ہیں۔" پھر وہ جھینپ گئی، "ٹیلی گرام میں تو یہی لکھا ہے۔"
اقصیٰ حیران حیران سی ان دونوں کے چہرے پر آتے جاتے دو مختلف رنگوں کو ہکا بکا ہو کر دیکھ رہی تھی۔ ایک طرف شوخی ہی شوخی تھی۔ دوسری طرف جھینپ، شرماہٹ۔
"کیا مطلب؟" وہ اتنی عقل مند تو نہیں تھی۔ "یہ آپ لوگوں کی کوئی سازش۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"
"میں سمجھاتی ہوں۔" جویریہ نے اسے بازو سے پکڑ لیا "دراصل زہیر کی طرف سے خط آیا تھا۔ اختری چچی نے ڈاک سے تمہارے ہاں کوئی لیٹر بم بھیجا تھا۔ جو تمہارے مرحوم خالو کے سر پر پھٹا۔"
"ہوں۔ ہوں۔" طلحہ نے ٹوکا لیکن وہ جاری رہی۔
"پھر طلحہ نے پروگرام بنایا کہ تمہاری امی کے اختلافات ختم کرنے چاہئیں۔ وہ ساری چیزیں طلحہ نے بیروت سے خریدی تھیں اسی لیے تو۔" وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ بھی ہو رہی تھی۔
"میں اعتراف کرتا ہوں۔" اس نے حلف لینے والے انداز میں ہاتھ اٹھایا۔
"یہ کیا ڈرامہ ہے؟" وہ جھنجھلائی۔ وہ جویریہ کے دکھ میں زخمی ہو رہی تھی اور جویریہ کو دیکھو۔
"دیکھو بھئی۔ حقیقت یہ ہے کہ۔" اب کے جویریہ نے رسان سے کہنا شروع کیا۔ "تمہاری امی کو منانے کے لیے ہم کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اپنے اپنے طور پر۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ بڑی آپا انہیں نہیں منائیں گی۔ بڑی آپا اپنے خط مجھ سے ہی لکھواتی ہیں اس لیے طلحہ کے تحفوں کے ساتھ میں نے ایک خط روانہ کر دیا۔ تم نہیں آئیں۔ تو ایک اور، دراصل یہ اسکرپٹ طلحہ نے تحریر کیا تھا۔ جس طرح ہمیں حکم ملا بڑی آپا کی طرف سے صرف ایک حکم تھا کہ تمہارے نام کی زمین کی رجسٹری تمہارے خالو کی وفات کے بعد تمہیں روانہ کر دی جائے۔ زہیر نے وفات کی اطلاع دی اور ہم سب نے چھپالی۔ اگر بڑی آپا رجسٹری کر دیتیں تو صلح کے راستے بند ہو جاتے تب بے چارے طلحہ کیا کرتے۔ ہم تو بے چاری کٹھ پتلیاں ہیں میں اور مہ رخ۔"
"مہ رخ بھی۔" وہ اپنے بے وقوف بنائے جانے پر جھلا رہی تھی۔
"اور ہاں زہیر بھی۔" طلحہ ہنس پڑا۔ "آپ کے گرد دشمنوں کا جال تھا اور بے خبر تھیں۔ بے چارے زہیر وہ پچھلی مرتبہ یہاں آئے تو ان کا کچھ کھو گیا تھا۔ شاید اب مل جائے۔" جویریہ جھینپ گئی۔
"کیا مطلب؟" اقصیٰ اب کے بھی کچھ نہیں سمجھ رہی تھی، وہ اسی طرح حیران و پریشان دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی تھی۔
"مطلب تو ان کی سمجھ میں خود بخود آجائے گا طلحہ۔ صرف چچی کی آمد کا انتظار ہے۔"
وہ باری باری ان کی شکل دیکھ رہی تھی۔ ان کا بلاوا کچھ سمجھ رہی تھی۔ کچھ بالکل نہیں۔ وہ جھنجھلا کر پلٹنے لگی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم سب مل کر مجھے بے وقوف بناؤ گے۔" وہ دروازے میں جمے طلحہ اور جویریہ کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں آکر اٹک گئی۔ ان دونوں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور جھنجھلائی ہوئی اقصیٰ ان کا گھیرا توڑ کر نکل بھاگنا چاہتی تھی۔
ان دونوں کے درمیان سے اختری چچی کا سرنمودار ہوا جویریہ اور طلحہ مل کر جی کھول کر ہنس رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان کھڑی حیران پریشان اقصیٰ جو اس نئی صورتحال کو اب کچھ کچھ سمجھنے لگی تھی۔
اختری چچی کے ہمہ وقت گھومتے، ناچتے، لہراتے ڈیلے پہلی مرتبہ ساکت ہو کر ان تینوں پر ٹک گئے۔ ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔
لیکن اقصیٰ پر یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ طلحہ کی تیمارداری اب عمر بھر کے لیے اس کی ذمہ داری بن چکی ہے۔

*